مکرّر ارشاد

شوکت تھانوی

مکرّر ارشاد

مزاحیہ مضامین

مکرّر ارشاد

شوکت تھانوی

حُسامی بُک ڈپو
مچھلی کمان، حیدرآباد ۵....۲

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ

اشاعت ۱۹۸۴ء
تعداد ایک ہزار

طباعت گولڈن پریس حیدرآباد

ناشر حسامی بک ڈپو
مچھلی کمان حیدرآباد (انڈیا)

قیمت بارہ روپے /-12

میٹھے چاول ۹
مشاعرہ اور جوتا ۱۴
مہمان ۲۱
سودیشی اور بدیشی ۳۳
دوست ۵۰
شاعر اور شاعری ۷۱
مطب ۹۷
مروت ۸۶
خدا سر دے تو سودا دے ۶۲

خودکشی ۱۷۹
آسیبی خلل ۱۹۰
تکرار ارشاد ۱۱۳
سودیشی ریل ۱۳۰
فیشن ۱۴۷
سودیشی ڈاک ۱۵۳
وی پی ۱۷۰
خودکشی ۱۷۹
آسیبی خلل ۱۹۰

میٹھے چاول

ہوا یہ کہ کل آئی تھی پورے پورے ایک روپے کی شکر اور بقول شخصے پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں تھا۔ میاں مجد کو جو شوق سوار ہوا تو کہہ بیٹھے۔ "ننھے کی اماں! ذرا میٹھے چاول پکلو" اب کیا تھا آ گئی قیامت اور شروع ہوا ساتھ نام اللہ کے انتظام۔

ننھے کو پالنے میں لٹا کر جو تشریف لے چلیں تو بھونچال کی طرح باورچی خانہ میں جا کر دم لیا اور احکام جاری ہونا شروع ہو گئے۔

"رحیمن ذرا چاول نکالو۔ شیرا پڑوس سے جا کر آگ لے آ۔ اور دیکھ کہیں دیر نہ لگانا۔ میاں کو کچہری جانا ہے تیری عادت ہے نگوڑ مارے کہ تو جاتا ہے تو وہیں کا ہو رہتا ہے۔ بس آگ لے کر فوراً لوٹ آنا۔ ابھی بہت سے کام ہیں۔ رحیمن اے بوا نوج تم سے

کوئی کام کرکے کوٹھری میں چاول کیا نکالنے گئیں۔ جیسے سات سمندر پار کرنے گئیں۔ اے مٹھی بھر چاول لانے میں اتنی دیر۔ نوج بیوی ایسا بھی کوئی کاہل ہو گھنٹہ بھر میں چاول لے کر لوٹی ہو۔ اچھا دروازہ سے جاکر دیکھو شیرا موا زندہ ہے کہ مر گیا۔ کمبخت آگ لینے گیا گیا ہے پڑوسن سے رشتہ جوڑنے گیا ہے میں تو کہتی تھی باتیں اُڑ رہی ہوں گی۔ سوا نو بج چکے ہیں ابھی نہ چاول چُنے گئے ہیں نہ آگ سلگی ہے رحیمن شیرا کو دیکھنے کیا گئی ہیں کہ اب لوٹنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی بوٹیاں چباؤں چاولوں کی فرمائش کر دینا تو سبکو آتا ہے اب دیکھیں آکر کرموے نوکر کیسے ڈھنگ کے رکھے ہیں۔ نگھنوں چنے چبوا رہے ہیں آگ لگے ایسے نوکروں پر ان سے تو میں بے نوکر ہی اچھی ان نمک حراموں کے بھروسے پر اگر کوئی کام چھوڑ دیا جائے تو قیامت تک تو انشاءاللہ ہو نہیں سکتا۔

لائے شیرا آگ لائے اور یہ موئے تم کہاں مر گئے تھے۔ میں کتیا کی طرح بھونک رہی ہوں نہ رحیمن کا پتہ ہے نہ تمہارا۔ رحیمن تم کو دیکھنے کیا گئیں ہیں کہ اب تک لوٹنے کا نام ہی نہیں لیا۔ میں نے کہا تھا کہ رحیمن بہن دروازے سے شیرا کو دیکھ لو ان کو تو بہانہ ملتا ہے بس غائب ہو گئیں۔ پہونچی ہوں گی اسی موئی شراتن کی لڑکی کے یہاں۔ ان کی بلا سے کسی کا کام ہو یا آگ

لگے۔ شیرا میرا بچہ ذرا چولہے میں آگ تو سلگا دے میں جب تک چاول چنتی ہوں۔ دیکھ وہیں توے کے پیچھے نمک کی ہنڈیا کے پاس پھکنی رکھی ہے تھوڑی سی کھپریل میں سے چیپٹیاں چن لا اور لالٹین میں سے ذرا سا تیل ان پر ڈال کر آگ سلگا دے میں اتنے چاول چنے لیتی ہوں۔ ان بوا رحیمن کے بھروسے پر رہی تو پک چکے چاول۔ سچ ہے اپنا کام دوسرے کے بھروسے پر کبھی نہ چھوڑے۔ خدا نے ہاتھ پیر دیئے ہیں کر کام کرو۔ اے لاؤ میں ابھی دم بھر میں سب چاول چنے دیتی ہوں۔ اے شیرا یہ تم آگ سلگا رہے ہو کہ بیٹھے کھیل رہے ہو۔ پھکنی نہیں ملتی تو ڈھونڈو۔ اللہ نے یہ بڑی بڑی آنکھیں کس لئے دی ہیں۔ اے ہاں ٹھیک ہے خوب یاد آیا پھکنی موئی لے تو کیسے صبح میں نے مرغی کو کھینچ کر ماری تھی وہ سامنے والے تاب دان میں گھس گئی۔ جا تو ذرا نکال لا۔

شکر ہے خدا نے ہماری رحیمن کو زندہ تو واپس کیا۔ بیوی آگے سے کان مروڑے۔ اب کبھی تم سے کسی کام کو نہ کہوں گی۔ تم ایسی گئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ لو میں نے چاول اتنی سی دیر میں سب چن کر رکھ دیئے۔ تمہارے بھروسے پر رہتی تو کچھ نہ ہوتا۔ ذرا پتیلی تو مانج لو۔ المونیم والی پتیلی لینا۔ اور جلدی سے مانجھ دو۔ موئی دیر پر دیر ہوئی چلی جاتی ہے اور وہ کپڑے پس رہے ہیں کچہری کا وقت آگیا لاؤ میں چاول تو چڑھا دوں

جبتک ' بلیں شیرا لپک کر ایک پیسے کی چھوٹی الائچی تو لے آ۔ دیکھو مُڑی تڑی نہ لانا۔ اگر خراب ہوئیں تو منہ پر کھینچ کے ماروں گی۔ اور دیکھ اگر تو نے دیر لگائی تو اچھا نہ ہوگا۔ ایسے جانا جیسے گیا ہی نہ تھا۔ شاباش۔ دیکھیں ہمارا شیرا کتنی جلدی لاتا ہے۔ رحیمن تم بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ ذرا تھوڑے چاول دھو کر چڑھا دو۔ توبہ بیوی تمھارا ایسا کاہل وجود ہو۔ جو کام تم کرنے کرنا ہوا کرے کہدیا کرو۔ اے ہاں رحیمن ذرا جلدی سے شیرا کو آواز دے لینا۔ گھی " " نا ہی بھول گئی۔ ما جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ میری بہن جلدی سے جاؤ۔ ابھی صحن کے دروازے ہی تک پہونچا ہوگا جب تک میں کٹوری دھوئے دیتی ہوں اسی میں گھی لے آئے گا۔ شیرا بھیا میں کہنا ہی بھول گئی تھی۔ اچھا تو سیر بھر چاول ہیں تم تین چھٹانک گھی عمدہ لے آؤ۔ لاؤ پیسے مجھ کو دے لو روپیہ مگر دیکھو گھی ذرا اچھا لینا سونگھ کر اور چکھ کر دیکھ لینا۔ بیٹا جلدی جا۔ اے لو دس بج گئے اب وہ جاتے ہیں۔ کچہری تھوڑی ان چاولوں کے پیچھے چھوڑ دیں گے۔ دن بھر فاقہ سے رہیں گے وہ روز کی دال روٹی بھی ان نگوڑمارے چاولوں کے پیچھے کھوئی۔ میں بھی آخر کیا کروں کوئی دس ہاتھ پیر تھوڑا ہی لگا لوں گی۔ یہ بھی کیا کوئی ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہے۔ کمبخت لکڑیوں نے بھی قسم کھالی ہے کہ آج نہ جلیں گی۔ نہ معلوم کہاں کی بھیگی ہوئی لکڑیاں کمبخت ہمارے حوالے کر دیتے ہیں۔

جیسے ہم کو خیرات ہی تو دے رہے ہیں۔ پھر مٹھی دام لیں گے اور چیز ایسی دیں گے جیسے مفت ہی تو دے رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اس موئے مولابخش حرام خور کے یہاں سے اب کبھی لکڑیاں آئیں تو اچھا نہ ہوگا " اُن کا " کیا لکڑیاں منگا کر ڈال دیں پھر تو جو کچھ آفت ہوگی وہ جلانے والے کی جان پر ہوگی۔ ان کی بلا سے یہاں موئی آنکھیں پھوٹی جا رہی ہیں اور لکڑیاں ہیں کہ سلگنے کا نام نہیں لیتیں۔ اے ننھے کے ابا تم تو اور ہاتھ پیر پھیلائے دیتے آخر میں پوچھتی ہوں کہ آج جو ذرا چاولوں میں دیر ہوئی ہے تو کیا تمھاری کچہری بھی بھاڑ میں پھری جلدی کھلنے لگی ایسی بھی کیا جلدی۔ چاول تیار ہیں اب کھا کر جاؤ ذرا ما شیرا الائچی لے آئے بس میں ابھی داغ لوں تو دیتی ہوں۔ ایسی چیز بھی پکا کر پچھتانا پڑتا ہے کہ کس شوق سے تو تم نے چاولوں کو کہا اور چلے بھوکے کچہری۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ ذرا ننھے کو گود میں اٹھا لو۔ کیسا بلک کے رو رہا ہے۔ موئے کی آواز پڑ گئی۔ توبہ تمھارا جیسا بھی کوئی سنگدل ہو۔ آواز سن رہے ہیں اور کوئی پروا نہیں۔ آخر تمھاری اولاد ہے اسے پرسوں سے ویسے ہی بخار آ رہا ہے۔ سینہ الگ جکڑا پڑا ہے۔ کھانسی ہے کہ دم نہیں لینے دیتی۔ نہ کوئی دوا ہے نہ علاج۔ اور ہو تو کیسے ہو تم کسی بات میں خبر ہی نہیں لیتے۔ میں گھر کی بیٹھنے والی آخر

یہ سب کیسے کروں۔ لو تم تو اس کو لے کر بیٹھ گئے ذرا کندھے سے لگا کر ٹہلو تو وہ چپ بھی ہو معصوم ہے کئی وقت سے دودھ نہیں پیا ہے لاؤ میں اس کو ذرا سا دودھ یہیں بیٹھے بیٹھے پلا دوں جب تک تم ذرا اس موئے شیرا کو باہر دیکھو کہ زندہ ہے موا یا اللہ کو پیارا ہوا۔ آگ لگے اس کمبخت کو جیسا اس نے مجھ کو عاجز کیا ہے۔ خدا اس موئے سے سمجھے آنے دو آج میں نے بھی وہ خبر لی ہوگی کہ بچا کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا یا تو آج سے وہ نوکری کو سلام کریں گے اور یا پھر ٹھیک ہی ہو جائیں گے۔ آیا موا ادھر تو آ کیوں رے یہ تو کہاں تھا کہہ دیا تھا کہ جلدی واپس آنا دو گھنٹہ لگا دیے کیا تو اندھا تھا۔ تجھے دکھائی نہیں دیتا تھا کہ میاں کچہری جانے والے ہیں۔ کیا آنکھیں پھوٹ گئی تھیں۔ مرے اللہ کرے تو آدھی رات کو ممیاتی ہوئی کھٹیا نکلے۔ اور اوپر سے گھور رہا ہے۔ آنکھیں نیچی کر مونڈی کاٹے نہیں تو اس وقت اپنی اور تیری جان ایک کر دوں گی۔ تو گھورے گا تو لے۔ گم گم، گھا گم، چٹاخ، پٹاخ، دھڑ پٹ، بھڑاخ.....!

شیرا کی تو مرمت شروع ہو گئی اور میاں امجد دم دبا کر بھاگے کچہری، راستہ بھر ان کے کانوں میں وہی بیوی کی جھنکار دار آواز گونجا کی کچہری پہونچے تو صاحب نے ٹانگ لی کہ دیر کیوں کی اور

اس بہانے سے امجد نے آج تک جتنی غلطیاں کی تھیں لگے سب گنوانے اور شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ گئے۔ ایک تو بیچارہ رات سے بھوکا اس پر صبح سے دس بجے تک بیگم صاحبہ کی مسلسل اور دھواں دھار تقریر نے دماغ خالی کر دیا تھا کہ اب صاحب کچھ شوق سوار ہوا لگے آئیں بائیں شائیں ہانکنے انسان ہی تو ہے دماغ بیچارے کا چکرا گیا۔ اب صاحب پوچھتے ہیں کھیت کی تو امجد بتاتے ہیں کھلیان کی اونٹ بکری آگرہ جواب دینے لگے صاحب کا ٹمپریچر دن بھر تیز رہا اور دن بھر امجد ایک ہاتھ پچکے ہوئے پیٹ پر رکھے اور ایک ہاتھ میں قلم لئے "ڈنڈم کا نڈم" کام کرتے رہے اور صاحب کی ڈانٹ سنا کئے کبھی کبھی یہ بھی یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ آج صبح کس کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا دن بھر کھانا نہیں ملا خیر نہ ملتا اوپر سے گالیاں کھانے کو مل رہی ہیں ارے صاحب جب آدمی بھوکا ہو تو آخر ٹھیک کام کس طرح کر سکتا ہے مارے بھوک کے اس کے تو پیٹ میں آگ لگی ہے اب جو صاحب پوچھتے ہیں کہ ریلوے والے مقدمے کا فائل کہاں ہے تو سوائے اس کے کیا جواب دے سکتا ہے کہ "میٹھے چاول" اس پر صاحب کو غصہ آتا ہے۔ خیر خدا خدا کر کے پانچ بجے اور امجد کچہری سے جان چھوٹی جلدی جلدی گھر پہونچے

دیکھتے کیا ہیں کہ نہ تو شیرا ہے اور نہ رحیمن بیوی چولہے کے پاس بیٹھی پھکنی لئے پھوں پھوں کر رہی ہیں اور چاول پتیلی میں کھدبد کھدبد مغل پٹھانوں کی طرح لڑ رہے ہیں امجد بھوک کی کمزوری کے مارے چاروں شانے چت چارپائی پر لیٹ گئے اور غنودگی طاری ہوگئی جب صبح آنکھ کھلی تو چاول تیار تھے مگر ان میں مینگنی نکل آئی اسلئے ٹیپو کو کھلا دیے گئے۔

آج جمعہ تھا امجد نے سب نمازیوں کے سامنے قسم کھائی کہ اب کبھی "میٹھے چاول" نہ پکواؤں گا۔

مشاعرہ اور جوتا

جوتا چرانے کی رسم پہلے مسجد کے لئے مخصوص تھی۔ لیکن جب نمازیوں نے نعلین در بغلین کا فیشن ایجاد کیا تو یہ رسم مسجد سے نکل کر شادی بیاہ کے موقعوں، دعوتوں، رقص کی محفلوں بلکہ ان تمام محفلوں میں جو فرنیچری نہیں بلکہ "فرشی" ہوں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ ادبی محفل یعنی مشاعرہ میں بھی اس کے جراثیم پائے جانے لگے جہاں بہت سے حاضرین محفل نئے نئے چمکدار جوتے بغرض نمائش پہن کر آئے وہاں بہت سے حاضرین سڑے ہوئے بوسیدہ یا شاعروں کی زبان میں "کہنہ مشق" جوتے بغرض تبادلہ پہن کر تشریف لائے اور آخری صف میں رونق افروز ہو گئے۔ اب ان کے

رونق افروز ہو جانے کے بعد ان کا وہ جوتا جو اُن کو گھر سے یہاں تک لایا تھا ان کا نہیں رہا بلکہ ان کی نظر انتخاب جوتے کے معاملہ میں تشریف فرما ہو جانے کے بعد قطعاً آزاد ہیں کہ واپسی پر اپنے پیر کے نمبر کا جو بہترین جوتا وہاں موجود ہو اور جس کسی کا بھی ہو وہ نہایت شوق سے پہن سکتے ہیں اور اس طرح پہن سکتے ہیں گویا یہ اُن ہی کا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ بوسیدہ جوتا کیا ہوگا؟ تو اس کے بعد یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ نئے جوتے کے مالک کا کیا حشر ہوگا؟ لیکن اگر ان دونوں سوالوں کو یکجا کر دیا جائے تو دونوں سوال ایک دوسرے کا جواب ہیں۔ اور اس معمہ کا حل صرف یہ ہے ؎

قسمت میں جو لکھا ہے ملتا ہے ہر صورت
جوتا نہ سہی چپل، چپل نہ سہی جوتا

حیرت تو یہ ہے کہ لوگوں نے اس بات پہ کبھی غور نہیں کیا کہ جو حضرات خدا کے گھر میں نہ چھوڑ سکتے ہوں وہ مشاعروں یا دوسری محفلوں کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں۔ مسجدوں میں تو کچھ خوف خدا بھی ہوگا۔ اور بفرض محال خوف خدا نہ سہی تو بھی یہ شعر کافی مشہور ہو چکا ہے ؎

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

لیکن محفلوں اور مشاعروں میں تو ابتک جوتے کے معاملہ میں کوئی احتیاطی تدبیر اختیار ہی نہیں کی گئی ہے جو جوتوں کے "جملہ حقوق محفوظ" کر دے اور نہ جوتوں پر "نمبر خریداری" رہتا ہے جس سے تبادلہ کرنے والے کو کوئی جھجک پیدا ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ جوتا جو محفل میں رکھا ہو ہر اُس شخص کو مل سکتا ہے جس میں کچھ جسارت ہو صرف اتنی کہ ایک مرتبہ جوتے میں پیر ڈال دے پھر تو وہ اُس کا ہے اور اس وقت تک اسی کا رہے گا جب تک کوئی اس سے عمدہ جوتا نہ مل جائے۔

انھیں تمام اندیشوں کی بنا پر ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ یا تو اپنے جوتے کو رجسٹرڈ کرا دیں گے اور اگر کوئی قیمتی جوتا خرید یں گے تو اس کو انشور کرا کے پہننا شروع کریں گے لیکن ان دونوں ارادوں سے پہلے چرچ مشن ہائی اسکول کے مشاعرہ میں جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں نعلین در بغلین کے فیشن کو آداب مشاعرہ کے خلاف سمجھ کر ہم نے اپنا جوتا وہیں چھوڑ دیا جہاں اکثر لوگوں کے جوتے دوسرا جنم لیا کرتے ہیں نتیجہ یہی ہوا کہ مشاعرہ میں بیٹھنے اور شعرا کا کلام سننے میں جوتے کو رجسٹرڈ یا انشور کرانے کی اسکیم ہمارے ذہن سے نکل گئی اور ختم

مشاعرہ پر جب ہم نے اپنے "رفیق پا" کی جستجو کی تو معلوم ہوا کہ "کوئی خضر صورت بزرگ" اُس کو لے اُڑے ہیں۔ بس ہم کو یہ اطمینان ہو گیا

ع "گیا جوتا پھر پیر آتا نہیں"۔

آخر کار "ہم ایک لاوارث" جوتا جس کو نعم البدل کہنا چاہیئے پہن کر اپنے جوتے کو "حاصل مشاعرہ" سمجھتے ہوئے گھر چلے آئے۔

اپنے "جوتۂ گم گشتہ" کا کیا ذکر کریں۔ ع "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" مضمون ہو جائے گا۔ لیکن جو جوتا ہم نعم البدل سمجھ کر مشاعرہ سے لائے ہیں اس کا ذکر نہ کرنا انتہائی بدمذاقی ہو گی۔ بس اُس کی اس قدر تعریف کافی ہے کہ اگر اس کی تصویر لے کر ٹائمز آف انڈیا میں بھیج دی جائے تو لوگ اس کو جوتے کی تصویر نہیں بلکہ دریائے نیل کے مگرمچھ کی تصویر سمجھیں وہ اس کا "خندۂ دندان نما" وہ اس کا "فارغ البال" ہونا وہ اس کی بانکی ترچھی چتون کوئی ہمارے دل سے پوچھے کہ کس قیامت کی ہیں اس کی اصلی قدر ایک صدی بعد ہو گی جب ماہرین آثار قدیمہ اس کو شاعر کا جوتا سمجھ کر تاریخی اہمیت دیں گے۔

مہمان

منجملہ دیگر آفات ارضی و سماوی کے ایک آفت مہمان بھی ہے جو ہندوستان میں عموماً اور ہندوستان کے مسلمانوں کے یہاں خصوصاً ناگہانی طور پر نازل ہوا کرتی ہے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کو مہمان بُرے لگتے ہیں یا ہم مہمانوں سے جان چراتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم ہندوستانی مہمانوں کی اصلاح کے لئے ہر وقت دست بدعا ضرور رہتے ہیں، کہ خداوند کریم ان کو مہمان بننا سکھا دے اور اگر ان کو مہمان بننا نہیں آ سکتا تو میزبانوں سے وہ اخلاق اور مروت اُٹھا لی جائے جو مہمانوں کی عادتیں خراب کرنے کا باعث ہے۔

یہ انسانیت ملاحظہ فرمایئے کہ رات کو ٹھیک ساڑھے بارہ بجے جب یہ ساری دنیا بےخبر سوتی ہے یہ مہمان صاحب کسی غریب پر بغیر کسی اطلاع کے

ایک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو جاتے ہیں کہ دروازہ کھلوانے کی صداؤں سے نہ تو وہ اُسکے اہل و عیال بلکہ تمام اہل محلہ جاگ اُٹھتے ہیں وہ بیچارہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آتا ہے کہ کیا آفت ہے تو یہ مہمان صاحب مع ایک عدد بستر اور ایک عدد ٹرنک کے سلام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں سچ بتائیے کہ ایسے موقع پر اُس بیچارہ کا کیا حال ہوگا جس کے گھر میں نہ تو جگہ ہے نہ چارپائیاں لیکن وہ اپنی دلی کیفیات کو چھپا کر اپنے چہرے مہمان نوازی کی شان پیدا کر لیتا ہے اور زیرِ لب تبسم ہو کر نہایت اخلاق سے کہتا ہے:۔

"اخاہ۔ کدھر راستہ بھول گئے۔ آج کدھر چاند نکل آیا ؂

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مہمان صاحب بھی اپنی بےحسی کا ثبوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ارے بھائی تم کیوں آتے میں ہی بے غیرت بن کر آنکلا دہلی جا رہا تھا نہ رہا گیا کہ آگرہ سے گذروں اور تم سے نہ ملوں۔ کہو اچھے تو رہے۔ اور بھابھی کیسی ہیں میرا سلام کہہ دینا اور ہمارا بیٹا کیسا ہے۔ بڑا دل چاہتا تھا اُس سے ملنے کو۔ اچھا بھائی اس تانگہ والے کو کیا دیدوں؟" میزبان فوراً تانگہ والے کو کرایہ دے کر رخصت کریگا۔ مہمان صاحب بھی رسمی طور پر کرایہ دینے سے

منع کریں گے۔ لیکن میزبان بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے" کہہ کر اس قصہ کو بھی ختم کر دے گا اور اب اسکو مہمان کے لئے چارپائی اور جائے قیام کی فکر ہوگی بیچارہ اپنے کسی بچے کو تخت پر سُلائے گا کسی کو بیوی کے پاس خود اپنا بستر کسی جگہ رکھے گا لیکن مہمان کے لئے بہترین چارپائی کا انتظام کریگا اور اس مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد اُس کو مہمان کے کھانا کھلانے کی فکر ہوگی یہ ایک بجے رات کا وقت۔ دیکھئے اور مہمان کو کھانا کھلانے کی فکر ملاحظہ فرمایئے لیکن وہ انتظام کرے گا اور مہمان صاحب بھی ایسے ہیں کہ اسی وقت ماحضر تناول فرمائیں گے۔ کھانے وغیرہ سے فراغت کے بعد مہمان صاحب تو چارپائی پر دراز ہو جائیں گے لیکن میزبان اب بھی انکے قریب بیٹھا ہوا ادھر اُدھر کی باتیں کرے گا کبھی پان کو پوچھے گا کبھی حقہ کو اور کبھی کبھی گھبرا کر یہ بھی پوچھ لے گا کہ "بھائی کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ یہ خانہ بے تکلف ہے خدا کے لئے تکلیف نہ اُٹھانا"

ہم سچ کہتے ہیں کہ جو حرکت ان مہمان صاحب نے اس غریب ہندوستانی میزبان کے ساتھ کی ہے اگر کسی انگریز کے ساتھ کرتے تو لطف آجاتا۔ اول تو رات کو اسٹیشن سے کسی انگریز کے گھر پر جانے کی جرأت ہی نہ ہوتی اور اگر ایسا ہی دماغ خراب ہو جاتا تو اس بُری طرح اس کے بنگلے سے نکالے جاتے کہ شاید پھر عمر بھر کسی کے مہمان نہ بنتے۔ انگریزوں پر یہ مہمان والی آفت اول تو نازل

ہی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو ناگہانی طور پر کبھی نہیں ہوتی۔ انگریز اپنے کسی دوست کے یہاں بدرجۂ مجبوری ٹھہرتے ہیں ورنہ ہوٹل قیام کرنے کے ہوتے ہیں اگر کسی انگریز کو اپنے کسی دوست کے یہاں ٹھہرنا ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس سے اجازت طلب کرتا ہے اگر اس نے اجازت دیدی تو خیر ورنہ سیدھا ہوٹل کا اور اگر ہوٹل نہ ہوا تو ڈاک بنگلہ کا راستہ لیتا ہے انگریز مہمان بھی ایسے بدتمیز نہیں ہوتے کہ میزبان کے سر پر بھوت کی طرح سوار ہو جائیں اور نہ میزبان ہی ایسا نامعقول اخلاق برتتے ہیں کہ خواہ مخواہ خود تکلیف اٹھائیں اور ایک مفت کی بلا سر لیں۔

یہ بات تو کچھ ہندوستان ہی کے مہمانوں میں پائی جاتی ہے کہ نہایت آزاد ہو کر بالکل بے تکلف ہو کر ہر اس شخص کے یہاں مع اسباب کے پہونچ جائیں گے جس سے ایک مرتبہ بھی مل چکے ہیں اور پھر اس کو اس قدر تکلیفیں پہونچائیں گے کہ اسی دنیا میں اس بیچارے کے تمام گناہ معاف ہو جائیں جس وقت سے تشریف لائیں گے اور جب تک واپس نہیں جائیں گے میزبان بیچارے کا یہ حال ہوگا کہ ان کو آرام پہونچانے کے لئے اپنی جان تک کی پروا نہ کرے گا۔ اور اس گھر کے تمام بچے اور بوڑھے مرد اور عورت صرف ایک مہمان کے لئے اس طرح مصروف اور مشغول رہیں گے کہ گویا مہمان نے آکر ان کے گھر میں کوئی دوکان کھول دی ہے کوئی پان لگا رہا ہے تو

کوئی حقہ تازہ کرنے میں مصروف ہے اور پھر وقت پر کھانا تیار کرنے کے لئے ایک پورا اسٹاف باورچی خانہ میں مصروف کار ہے کسی کے ہاتھ میں توا ہے کوئی لگن دھو رہا ہے کوئی سل بٹے کا انچارج ہے اور خود صاحب خانہ ہیں کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد باہر سے آکر تمام انتظامات کا معائنہ فرما جاتے ہیں کبھی خفا ہوتے ہیں کہ لاحول ولا قوۃ ابھی تک مرغ بھی صاف نہیں کیا گیا وہ مغرب کے بعد کھانا کھانے کے عادی ہیں اور ہمارے یہاں ابھی تک چاول تک نہیں چڑھائے گئے۔ خدا کے واسطے تم لوگ میری ناک نہ کٹوانا کہو تو میں کچھ بازار سے منگوا لوں۔ اس کے جواب میں کچھ کام کرنے والے تو چپ رہیں گے۔ کچھ زیر لب بڑبڑا کر اپنی ناراضگی کا اظہار کریں گے لیکن گھر والی اس قسم کی باتوں کا جواب آخر کھٹ سے فوراً کسی برتن کو غصہ سے رعدنما آواز کے ساتھ رکھ کر کہے گی کہ "واہ ہاتھ پیر پھیلائے دیتے ہیں کوئی چار ہاتھ پیر کیسے لگائے ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں کس وقت تو سودا آیا ہے میں سودا لینے بھی نکل گئی ہوتی تو ایک بات تھی۔ ابھی دھوپ نکلی ہوئی ہے اور جلدی ایسی ہے جیسے چار دن کے فاقے سے ہوں۔"

اب اگر صاحب خانہ یعنی میزبان نے گھر والی کی بات کا کوئی جواب دیا تو یہی سلسلہ اس حد تک پہونچ سکتا ہے کہ بازار سے کھانا آجائے اور مہمان سے کہہ دیا جائے کہ "گھر میں اختلاج کا ایسا دورہ پڑا ہے کہ تمام گھر پریشان ہے اور اگر صاحب خانہ نے دور اندیشی سے کام لے کر سکوت اختیار کیا تو

تھوڑی دیر کے بعد کھانا تیار ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ایک مہمان کے آجانے سے گھر کا نظام ایسا بدل جاتا ہے کہ گویا قیامت آگئی اور مہمان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی زیادہ سے زیادہ یہ کہ پر تکلف کھانا دیکھ کر ایک مرتبہ اگر دل چاہا تو اخلاقاً اور رسماً صرف اتنا ضرور فرمادیتے ہیں کہ "اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" اور بس لیکن اگر میزبان بیچارہ یہ تکلفات نہ کرے تو یہی مہمان صاحب اس سے اس قدر خفا ہو جائیں گے دوسروں کے یہاں جاکر اسکا مذاق اڑائیں گے اُسکی شکایتیں کرینگے اور اسکو مہمان نوازی کے جرم میں ہر جگہ بدنام کریں گے۔

مہمانوں کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ ہیں جو اپنی صاحب بہادریت کی وجہ سے میزبان کو تکلیفیں پہونچائیں گے کہ صبح ہوتے ہی چاء وغیرہ کے انتظام کے علاوہ ان کے لئے نائی کا انتظام کیا جائے غسل کا انتظام کیا جائے اور رفع حاجت کیلئے بھی ہو ان کے لئے کموڈ کا انتظام کیا جائے ورنہ تمام خلوص تواضع خاک میں مل جائیگی

دوسری قسم وہ ہے جو اپنے گنوارپن سے میزبان کا ناک میں دم کر دیتی ہے کہ انکے لئے میز پر کھانا لگایا گیا تو وہ ہاتھ دھوکر بغیر کرسیاں لگنے کا انتظار کئے ہوئے بسم اللہ کہکر میز پر چڑھ کر بیٹھ گئے اب نہ اُنکو میز پر سے ہٹاتے بن پڑتا ہے نہ انکے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے کو دل چاہتا ہو رفع حاجت کے لئے اُنکو غسل خانہ میں بھیجا تو وہ کموڈ کو چاروں طرف سے دیکھ کر بعینہ واپس چلے آئے کہ یہاں تو کوئی جگہ

رفع حاجت کی نہیں ہے۔ اُن کے لئے سونے کا انتظام کیا اور چارپائی کے چاروں طرف بیس ہزار اگالدان رکھدیے لیکن صبح اُٹھ کر دیکھئے تو انشاءاللہ کمرہ کے تمام فرش مع دیواروں کے پان کی پچکاریوں سے گلزار چمن بنا ہوا ہے گا۔ ان کو اپنے کمرہ میں چھوڑ کر دفتر چلے جایئے تو واپسی میں کمرہ اس طرح کھلا ہوا نظر آئیگا گدّے دار کرسیوں کے بیچ میں حقہ اوندھا پڑا ہوگا اور مہمان صاحب غائب ہوں گے۔ اب اُن کا انتظار ہو رہا ہو نوکر بار بار کھانے کا تقاضا کر رہا ہے لیکن کھانا کیسے کھایا جائے۔ مہمان صاحب غائب ہونگے میزبان بیچارہ اپنی بھوک کو ضبط کئے پیٹ پر ہاتھ رکھے اُنکے انتظار میں بیٹھا رہے گا یہاں تک وہ نہایت اطمینان سے رات کو جس وقت بھی چاہے گا تشریف لے آئے اور ان کو اپنے دیر کرنے پر قطعاً افسوس نہ ہوگا بلکہ الٹی یہی شکایت ہو گی کہ خود میزبان اس آوارہ گردی میں ان کے ساتھ کیوں نہ تھا

ایک تیسری قسم ان مہمانوں کی ہے جو غالباً میزبان کے یہاں مستقل سکونت کرنیکی غرض سے تشریف لاتے ہیں کہ مہینہ مہینہ بھر ہو جاتا ہے لیکن وہ جانے کا نام نہیں لیتے۔ یہانتک کہ میزبان تھوڑے دنوں تکلف کرنے کے بعد آخر ان کے ساتھ وہ سلوک شروع کر دیتا ہے جس کو اصطلاح عام میں روزمرہ کہتے ہیں یعنی نہ تو ان کے لئے کھانے پر اکتفا کیا جاتا ہو نہ ان کے لئے کھانے میں کوئی خاص اہتمام ہوتا ہے اور نہ اُن سے دن بھر

میں پچاس ہزار مرتبہ یہ پوچھا جاتا ہے کہ "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے" لیکن اس لاپروائی کے باوجود وہ میزبان کے یہاں بالکل اپنا گھر سمجھ کر رہتے ہیں۔ بلکہ ان کو اپنے نزدیک یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ ہماری وجہ سے ہمارے میزبان کو کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن اسی تیسری قسم میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو عرصہ تک مہمان رہ کر اپنے کو اس گھر کا ممبر سمجھنے لگتے ہیں اور میزبان کے ملازموں پر میزبان کے بچوں پر اور میزبان کی بیوی پر اس طرح حکومت شروع کر دیتے ہیں گویا یہ سب کچھ ان ہی کا ہے کھانے میں دیر ہوئی تو تقاضا لکھا بھیجا کھانے میں نمک تیز ہے تو اپنی ناراضگی کا اظہار فرما دیا۔ کوئی ایسی چیز پک گئی جو آپ کو اچھی نہیں معلوم ہوتی تو اس کی شکایت کر دی غرضکہ وہ اس طرح رہنا شروع کر دیتے ہیں گویا یہ ان کا ذاتی گھر ہے اور وہ ہمیشہ سے یہیں رہتے ہیں۔

ہم کو تو دراصل ایسے مہمان اچھے لگتے ہیں جو اطلاع کے بعد ہمارے یہاں آئیں ہم ان کو موٹر لے کر اسٹیشن سے لینے جائیں انکی دل کھول کر خاطر تواضع کریں ایک وقت ان کے اعزاز میں ڈنر دیں جس میں ہمارے مخصوص احباب بھی شریک ہوں وہ اس وقت تک ہمارے یہاں ہیں جیتک دعوتوں کا سلسلہ جاری رہے اس کے بعد وہ رخصت ہو جائیں اور رخصت بھی اس طرح ہوں کہ ہمارے بچوں کو روپے دیں ہمارے نوکروں

کو انعام دیں اور ہم کو بھی اپنے یہاں مدعو کر کے چلے جائیں۔

خیر ان باتوں سے تو نہیں معلوم لوگ ہم کو کیا سمجھیں گے یہ تو مذاق تھا۔ ہاں ہم کو دوست ایسے اچھے لگتے ہیں جو مہمان نہیں اور مہمان ایسے ایسے اچھے لگتے ہیں جو ہوٹل میں ٹھہرنے کے بعد ہم سے ملنے آ جایا کریں یا زیادہ سے زیادہ ہماری اجازت کے بعد یعنی ہم کو مطلع کر کے ایک آدھ دن ہمارے یہاں ٹھہر جائیں اور وہی زندگی بسر کریں جو ہم کرتے ہیں یعنی ہم رفع حاجت کے لئے کموڈ استعمال کرتے ہیں تو وہ بھی کریں اور اگر ہم بغیر کموڈ کے بھی یہ حرکت کر لیا کرتے ہیں تو ان کو بھی پس و پیش نہ ہو اگر ہم مغرب کے وقت کھانا کھانے کے عادی ہیں تو وہ ہمارے وقت کا خیال رکھیں اور اگر ہم رات کو دو بجے کھانا کھاتے ہیں تو وہ ہماری وجہ سے یہ تکلیف بھی برداشت کرنے کی کوشش کریں مختصر یہ کہ ان کے آ جانے سے ہم کو اپنے گھر کے آسمان کو زمین اور زمین کو آسمان نہ بنانا پڑے۔

ہمارے بہت سے کرم فرما ایسے بھی ہیں جنکو واقعی مہمان بننا آتا ہے یعنی وہ بالکل ہماری مرضی کے مطابق مہمان بن کر رہتے ہیں۔ ہم کو ان کا آنا بالکل ناگوار نہیں ہوتا ہم اُن کے ساتھ تکلف نہیں برتتے اور وہ ہمارے یہاں کی نان جوین سے ایسے ہی خوش رہتے ہیں جس طرح عام طور پر لوگ پلاؤ سے خوش ہوتے ہیں اُن کو ہماری مشکلات کا احساس ہو

وہ جانتے ہیں کہ ہم ان کے لئے جگہ نکالنے میں کس قدر دقت ہوئی ہوگی اور انکو یہ بھی معلوم رہتا ہے کہ اگر وہ جلد سے جلد چلے جائیں گے تو گویا ہم پر ایک قسم کا احسان ہوگا. واقعی ہم اس زمانے میں اس قسم کے مہمانوں کی سچے دل سے قدر کرتے ہیں اور ہماری دعا ہے کہ خدا کرے تمام دنیا کے مہمان اسی قسم کے ہو جائیں۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہم نے اب تک مہمانوں کی جتنی قسمیں بتائی ہیں وہ سب کم از کم ہمارے لئے قابل برداشت ہیں لیکن ایک آخری اور سب سے زیادہ مہلک قسم وہ ہے جس کا خیال آتے ہی ہمارا خون خشک ہوجاتا ہے ہم لرزہ براندام ہوجاتے ہیں اور اگر بجائے خیال کے وہ واقعی ہمارے سامنے آجائے تو شاید ہم چیخ مار کر بیہوش ہوجائیں لیکن ہمارے جنتی ہونے میں کیا شک ہے کہ ہم نے اس قسم کے مہمانوں کو بھی نبایا ہے اور ہم کو خود تعجب ہے کہ کس طرح نباہا. ملاحظہ فرمائیے کہ کسی نے ہم سے آکر کہا کہ تمہارے وہ علی گڈھ والے دوست جن کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں اور جو شاعر بھی ہیں اور جن کا ذرا دماغ خراب سا ہے اور جو اپنے کو بہت بڑا آدمی سمجھتے ہیں فتح گنج والی در بجے سنگھ کی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں. ہم یہ سنتے ہی بھیجے ہوگئے کہ ہمارا دوست اور ہمارے شہر میں آکر سرائے میں ٹھہرے فوراً پہونچے .... اور ان کو مع اسباب کے غریب خانہ پر لے آئے. ہم نے گناہ کیا اور ہم کو اسکی سزا دوسرے دن

بھگتنا پڑی کہ انھوں نے صبح ہی کھانے کے وقت کہہ دیا کہ "مجھ کو تو حکیم نے مرغ کی یخنی بتائی ہے اور ہر قسم کی دال کو منع کردیا ہے اور کہا ہو کہ پلاؤ کھایا کرو۔ اور یہ بھی ہدایت کی ہے کہ تیل کھٹائی اور مرچ نہ کھانا" ہم نے ان کے حکیم صاحب کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کردیا تو ایک روز کے بعد پھر فرمانے لگے کہ "آپ کے یہاں نہ تو یخنی ٹھیک بنتی ہے نہ پلاؤ اچھا پکتا ہے مات کو دونوں کو ملا کر مرغ پلاؤ پکوایئے شاید کچھ منہ کا مزا بدلے" خیر صاحب یہ بھی سہی بلکہ اور جو کچھ انھوں نے فرمایا وہ بھی سہی۔ اب ایک دن فرماتے ہیں کہ آپ سے اور جیرجی شومیکر سے مراسم ہیں ایک جوتا دلوا دیجئے قیمت جاکر بھیج دوں گا" ارادہ تو ہوا کہ دریافت کروں کہ "حکیم صاحب نے جوتا بھی بتایا ہے" مگر چپ ہو رہا اور چونکہ میں اس معاملہ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا خاموش ہو رہا لیکن اُن کو یہ پہلی شکایت تھی جو میری طرف سے پیدا ہوئی اسی طرح کسی دن کپڑے کی فرمایش میں نے ٹالی کسی دن سینما کی خواہش کو رد کیا کسی دن ان سے صرف اتنا کہہ دیا کہ آپ میرے گھر پر اپنے داموں سے کوئی کھانے کی چیز نہ خریدا کریں میں حاضر ہوں اور یہ خدمت مجھ ہی کو بجا لانے دیجئے" بس جناب پھر جو ہم گھر آکر دیکھیں گے تو ہمارے مہمان کا ہم کو خط ملے گا کہ آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ لیکن میں مہمان بن کر وہ تذلیل برداشت نہیں کرسکتا جو آپ

نے میری کی۔ مجھ کو سرائے میں ٹھہرنا بہ نسبت اس مہمان بننے کے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے اور میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں"

اب بتائیے کہ اس خط کو پڑھ کر ہم میزبان بننے اور مہمان بنانے سے توبہ نہ کر لیں تو کیا کریں بلکہ ہماری تو یہی رائے ہے کہ دنیا سے مہمانی اور میزبانی دونوں کو جلد تر اٹھ جانا چاہئے اور ہوٹلوں کو آباد ہونا چاہئے۔

سودیشی سے بدیشی

یا تو شدت پسند ہونا ہندوستانیوں کی فطرت میں داخل ہے یا مزاج کچھ اس قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ لاکھ سمجھاتے رہے خوشامدیں کیں اور بقول پنجابی احباب کے لکچر پلائے کہ دیکھو میاں اور چاہے جو کچھ کرو مگر خدا کے لئے پڑھنا لکھنا نہ چھوڑو۔ اگر اس سال فیل بھی ہو گئے تو آئندہ سال پاس ہو جاؤ گے پڑھ لکھ کر چاہے لیڈر بننا چاہے جیل جانا تم کو اختیار ہے لیکن ابتر جاہلوں کا ٹھکانا جیل میں بھی نہیں ہے تمہارے ایسے محدود استعداد کے افراد ملک کو بجائے آزاد کرانے کے اور بھی مشکلات میں مبتلا کرنے کے باعث ہو سکتے ہیں۔ تم بغیر لکھے پڑھے چاہے کھدر پہنکر اپنے کو قومی لیڈر سمجھنے لگو چاہے اسکول چھوڑ کر براہ راست جیل خانہ چلے جاؤ لیکن رہو گے جاہل اور ایک والنٹیر سے زیادہ کوئی حیثیت تم کو حاصل نہ ہوگی

لیکن ہمارا یہ سمجھانا بجھانا بالکل ایسا ہی ہوتا تھا گویا بھینس کے آگے بین بجایا جا رہا ہے۔ مرزا سب کچھ سنتے تھے لیکن سمجھتے صرف یہ تھے کہ گویا ہم بیوقوف ہیں اور اپنی طرح انکو بھی بیوقوف بنانا چاہتے ہیں اول تو وہ ہماری کسی بات کا جواب ہی نہ دیتے تھے اور اگر دیا بھی تو صرف یہ کہ تم کیا جانو تمھارے دماغ میں تو غلامی اس طرح ٹھونس دی گئی ہے کہ تم آزادی کا خیال بھی نہیں لا سکتے ہندستان ہمارا ہے اور ہم اس کے ہیں ہم اس کو آزاد کرائیں گے اور آزاد بنیں گے!

ہم نے لاکھ کہا کہ "دیکھو بھائی ہندوستان کی آزادی ہم کو بھی اچھی معلوم ہوتی ہے ہم خود بھی آزاد بننا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ہم قومی رہنما نہیں بن سکتے اور اگر بنیں گے تو نااہل ثابت ہوں گے اور ہماری نااہلی سے ان لوگوں کی خدمت پر برا اثر پڑے گا جو کامیابی کے ساتھ اس مقصد میں ساعی ہیں۔ ہم کو اپنے فرائض دیکھنا ہیں۔ اور ان کو پورا کرنا ہے، ہم تعلیم حاصل کر رہے ہیں صرف اپنے لئے نہ کسی دوسرے کے لئے ہماری تعلیم سے ہم کو اور ہمارے ملک کو فائدہ پہونچے گا۔ اور ممکن ہے کہ ہم تعلیم یافتہ ہونے کی صورت میں موجودہ صورت سے زیادہ مفید خدمات انجام دے سکیں"۔ لیکن ہماری اس بکواس پر مرزا نے کبھی توجہ نہ کی اور آخرکار ایک دن "بندے ماترم" "انقلاب زندہ باد" کہتے ہوئے اور "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" گاتے ہوئے اسکول سے نکل ہی آئے۔

اسکول چھوڑنے پر گھر کے بڑے بوڑھوں نے مخالفت کی اور ہماری طرح کے بہت سے احباب نے سمجھایا مگر وہ تو گویا یہ طے ہی کر چکے تھے کہ آیندہ سال کانگریس کا صدر منتخب مجھ ہی کو ہونا ہے اور جس وقت میری جے کے نعرے بلند ہوں گے یہ مخالفت کی آوازیں خود بخود دب جائیں گی لہٰذا ان کے فیصلہ کے آگے کسی کی نہ چلی اور انھوں نے ایک ملکی رہنما کی سی زندگی شروع کر دی۔ کوٹ پتلون شیروانیاں ٹوپیاں قمیص پاجامے ایک ایک کر کے نذر آتش کر دیے گئے۔ اور شہر بھر میں جو سب سے موٹا کھدر دستیاب ہو سکا اس کا کرتا پاجامہ اور ٹوپی بنائی گئی بجائے بوٹ کے وہی بارہ آنے والی چپل خریدی گئی جو تارکین موالات پہنا کرتے ہیں اور اب وہ صورتاً پکے لیڈر معلوم ہونے لگے۔ لیکن ان کی شدت پسندی کے نزدیک یہ انقلاب گویا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ جس زمین پر چلتے ہیں اور جس آسمان کے نیچے رہتے ہیں، یہ سب کھدر کے ہو جائیں۔ اگر ان کا بس چلتا تو کھدر کھانا بھی شروع کر دیتے اسلئے کہ ان کے استعمال کی ہر چیز صرف سودیشی ہی نہیں بلکہ کھدر کی ہونا چاہئے تھی۔ لحاف توشک چاندنی اور تکیہ وغیرہ تک تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن عینک کے شیشہ صاف کرنے کے کپڑے سے لے کر جوتا پونچھنے کے کپڑے تک اور جائے نماز سے لیکر میز پوش تک سب کھدر ہی کھدر نظر آتا تھا

تھا حالانکہ ان حضرت سے لاکھ کہا کہ "جناب ابھی کھدر کی اتنی کثرت نہیں ہے کہ آپ یکسر اس فیاضی کے ساتھ استعمال کریں۔ اگر ہر ہندوستانی ایک ایک کھدر کا رومال رکھنا چاہے تو شاید ہندوستان میں کھدر ناکافی ثابت ہوگا آپ جو اس بے تکے پن سے کھدر استعمال کر رہے ہیں اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ گویا تمام ہندوستان میں آپ ہی ایک قوم پرست ہیں اور باقی چاہے جو کچھ پہنیں اور لوگوں کے واسطے بھی باقی رہنے دیجئے گا یا نہیں؟" لیکن انھوں نے ہمارے اس کہنے کو اس طرح ٹال دیا جس طرح بڑے بوڑھے نادان بچوں کی بات پر مسکرا کر خاموش ہو جاتے ہیں لہٰذا ہم نے اور ہماری طرح اور دوسرے لوگوں نے بھی ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اسلئے کہ ان کے نزدیک سمجھدار اور ذی ہوش انسان وہی تھا جو خود سر سے پیر تک "سودیشی بھنڈار" بنا ہوا ہو اور دوسرے کو بھی اسی حالت میں دیکھ کر خوش ہوتا ہو۔ لہٰذا اس حیثیت سے ہم لوگ تو ایک سرے سے بیوقوف ہی تھے ہماری بات وہ مانتے تو کیا مانتے۔

یہ تغیر ملاحظہ فرمائیے کہ جس دن سے "شریمان مرزا جی" نے کھدر میں اپنے کو لپیٹا گویا ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ گھر والوں سے غیر مطمئن، احباب سے ناخوش، حد یہ ہے کہ اپنی ہونے والی سسرال سے بھی متنفر ہو گئے جس کے سنگ آستاں پر جبین نیاز جھکانا نہیں بلکہ گھسنا ان کے نزدیک جزو ایمان تھا اور اس تمام تغیر کا

سبب وہی سودیشی اور بدیشی مسئلہ تھا۔ گھر والے ان کی کھدر پوشی پر خوش نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا ان سے ناخوش ہونا ایک اصولی بات تھی۔ احباب بدستور سوٹ یا بدیشی کپڑے کا بنا ہوا ہندوستانی لباس پہنتے تھے لہٰذا ان سے ترک موالات بھی لازمی ہوا۔ اب رہی ہونے والی سسرال کا یہ حال تھا کہ انسانوں سے لے کر جانوروں تک کے لئے ہر چیز بدیشی مہیا کی جاتی تھی خود وہ مستورہ جن کی شادی مرزا کے ساتھ ہونے والی تھی ہر روز صبح کو انگریزی صابن سے منہ دھو کر انگریزی تولیا سے پونچھتی تھیں اور انگریزی پوڈر لگا کر انگریزی آئینہ میں انگریزوں جیسا منہ دیکھتی تھیں پھر انگریزی تیل سر میں ڈال کر انگریزی کنگھی سے انگریزی مانگ نکالی جاتی تھی اور اس پر انگریزی کلپ لگائے جاتے تھے اس کے بعد انگریزی کپڑے کی بنی ہوئی ساری اور انگریزی دکان کا سیا ہوا بلوز پہن کر انگریزی موزے اور انگریزی جوتا پہنے ہوئے انگریزی موٹر پر بیٹھ کر انگریزی بولتی ہوئی انگریزی اسکول جاتی تھیں۔ اور وہاں انگریزی کتابیں پڑھتی تھیں۔ اب بتائیے کہ وہ کس طرح مرزا کی بیوی بن سکتی تھیں۔ مرزا تو ہر مرتبہ بیوی کا تصور آتے ہی اس طرح "لاحول ولا قوۃ" پڑھتے تھے گویا تارکین موالات کے شیطان کی یہی وضع قطع ہوتی ہے جو مرزا کی ہونے والی بیوی کی تھی۔ یا تو یہ حال تھا کہ شادی کی مقررہ تاریخوں میں ایک عزیز کا انتقال ہو گیا تھا اور شادی

کی تاریخ بڑھ گئی تھی تو ان کی روح تک سے متنفر تھے۔ وہ تو یہ کہئے کہ یہ حرکت ایک مرحوم کی تھی اگر کسی "اینجہانی" نے اسی طرح شادی میں رکاوٹ ڈالی ہوتی تو مرزا اس کی اور اپنی جان ایک کر دیتے یا وہ ہی نہ رہتا یا مرزا ہی نہ رہتے۔ لیکن مرے ہوئے کے ساتھ کیا کر سکتے تھے بہر حال یہ تو طے تھا کہ خدا کے یہاں بدلہ ضرور لیں گے۔ یا تو یہ زور شور تھا یا اب یہ حال تھا کہ شادی کے نام سے ان کو تنفس کا دورہ اٹھتا تھا اور اس طرح جلد جلد پہلو بدلنا شروع کرتے تھے گویا کسی اڑیل ٹٹو کو کھونٹے سے باندھ کر ہنٹر لگائے جا رہے ہیں۔

بات اصل میں یہ تھی کہ اس تبدیلی نے شادی کے معاملہ میں بھی معیار انتخاب بدل دیا تھا۔ اب وہ ایک برق مجسم ایک شعلۂ لرزاں معطر ریشم میں لپٹی ہوئی حسین تیتری کو اپنی رفیقۂ حیات بنانا تو کجا اپنی رفیقۂ حیات کی خادمہ بھی بنانا نہیں چاہتے تھے اس کا سرو قد ہونا ان کی نظروں میں کھٹکتا تھا اور وہ کہتے تھے کہ کاش یہ کپاس قد ہوتی۔ اس کے سنہری ریشم کی طرح ملائم بال بھی ان کو اچھے نہ لگتے تھے غالباً وہ چاہتے ہوں گے کہ سوت کی طرح موٹے بال ہوتے اسلئے کہ جن باتوں میں نسائیت ہو یا نسائیت کی بو بھی پائی جائے اس سے ان کو تنفر ہو گیا تھا خواہ وہ ان کی ہونے والی بیوی کا حسن ہی کیوں نہ ہو اس قسم کی شدت پسندی نہیں رہتی بلکہ اسکی تو ایک طوفانی کیفیت ہوتی ہے کہ الفاظ کی صورت میں نقل و حرکت کی شکل میں

اس کا اظہار ہوتا ہی رہتا ہے اور بالکل مدو جزر کی سی حالت ہوتی ہے چنانچہ شادی کے معاملہ میں بھی مرزا نے سودیشی جوش میں آ کر اپنے گھر میں کہہ دیا کہ میں جمیلہ کے ساتھ تو شادی نہ کروں گا حالانکہ گھر میں کسی کو مرزا کے اس انکار کی توقع نہ تھی لیکن یہ الفاظ سن کر کسی کو تعجب بھی نہ ہوا اس لئے کہ تمام گھر انکی سودیشی ادائیں دیکھ کر ان کے دماغ کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ پھر بھی شادی کا معاملہ ایسا تھا کہ یہ الفاظ سن کر سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اسلئے کہ جمیلہ بھی کوئی غیر نہ تھی۔ مرزا کی حقیقی چچا زاد بہن تھی۔ اس انکار سے اول تو اس کی بدنامی دوسرے خود مرزا کے والد محترم کو یہ گوارا نہ تھا کہ مرزا کی اس جسارت کو خاموشی کے ساتھ ٹال دیا جائے اور غریب جمیلہ کو بدنام ہونے دیا جائے انھوں نے مرزا کو سمجھایا اور خوشامدیں کیں۔ سختی کیا خفا ہوئے برا بھلا کہا۔ خود گھر سے نکلنے کی دھمکی دی گھر سے نکالنے کو کہا۔ صورت نہ دیکھنے کے عزم بالجزم کا اعلان فرمایا۔ عاق کر دینے کے ارادے کا اظہار کیا۔ لیکن مرزا نے ہر بات کا جواب اس سکوت کے ساتھ دیا جسمیں لوگ منہ پھلا کر دل ہی دل میں گالیاں دیا کرتے ہیں۔ جب والد صاحب قبلہ اپنے فرمانبردار نور نظر کو ہر طرح سے ڈرا دھمکا چکے تو والدہ محترمہ نے اپنے لخت جگر کو رو کر گڑگڑا کر ہاتھ جوڑ کے دودھ نہ بخشنے کا الٹی میٹم دے کر اپنے مرنے کا عبرت انگیز بیان اور ایک تمنا کو لئے ہوئے قبر میں جانے کا درد انگیز ذکر کر کے

پنے سر کی قسم دے کر "اولاد ماں باپ کے احسانات سے سبکدوش نہیں ہوسکتی" کے موضوع پر ایک وعظ نما تقریر کر کے حکم دیا، استدعا کی، اکڑ کے کس اور ہاتھ جوڑ کے کہا کہ "بیٹا ایسا غضب بھی نہ کرنا بڈھے ماں باپ منہ کالا ہو جائیگا صورت دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔" لیکن ہمارا مرزا کچھ ایسا ویسا نہ تھا جس کو یہ سبز باغ دکھا کر یا گیدڑ بھبکیوں سے ڈرا کر قابو میں کیا جاتا۔ وہ شیر کی طرح مخالفت کے طوفان کا مقابلہ کرتا رہا اور ہر مصیبت کے جھیلنے پر آمادہ

مرزا کے والد ہمارے بڑے قائل تھے کہ ہم کو اپنے اشاروں پر مرزا کو چلانا ایسا آتا ہے جیسے بندر والا بندر کو اشاروں سے نچاتا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک مرزا کا صرف یہ علاج رہ گیا تھا کہ ہم بھی ان سے کہیں کہ "مان جاؤ"۔ چنانچہ ہم کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ مرزا کو ہموار کریں حالانکہ ہم یہ جانتے تھے کہ مرزا کو جس مرض کا دورہ اٹھا ہے اس کا علاج خود مہاتما گاندھی کے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن ان کے والد کے حکم کی تعمیل ضروری تھی اور ایسی صورت میں جبکہ وہ اپنی تمام پدری طاقتوں کا استعمال کر چکنے کے بعد ہماری طرف امداد طلب نظروں سے دیکھ رہے ہوں چنانچہ ہم ناصحانہ الفاظ پر اس طرح غور کرتے ہوئے جیسے شعرا ردائے میں شعر کہتے ہیں مرزا کے پاس پہونچے اور سودیشی تحریک کے فوائد پر ایک ایسی تقریر کی

کہ مرزا کی باچھیں کھل۔ دیر تک ہماری ذہانت، عقلمندی، قابلیت، سنجیدگی اور روشن دماغی کی تعریفیں کرتے رہے جب ہم نے یہ دیکھا کہ اب ذرا خوش ہیں اور امید ہے کہ منہ مانگی مراد ملے تو ہم نے ہمت کر کے کہدیا۔

"ارے یار یہ کیا قصہ ہے تمھاری شادی کا؟"

کہنے لگے: "ہماری شادی کا؟"

ہم نے کہا: "ہاں تمھاری شادی کا سنا ہے کہ تم کو کچھ پس و پیش ہے۔"

کہنے لگے: "بھائی تم خود سمجھدار ہو اور تم نے میری فطرت کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ تم خود بتاؤ کہ جس لڑکی سے میری شادی طے ہوئی ہے اس سے میرا نباہ کیسے ہوگا؟"

ہم نے کہا: "یہ تو صحیح ہے مگر کیوں؟"

کہنے لگے: "بھائی یہ تو موٹی سی بات ہے کہ میں قوم کا خادم بنجانے کے بعد بیوی کا خادم بننے کے قابل نہیں رہا۔"

ہم نے کہا: "یہ کیا؟"

کہنے لگے: "اس کا مطلب یہ ہے کہ میری اور اس لڑکی کی معاشرت میں وہی فرق ہے جو ہندوستانیوں اور انگریزوں کی معاشرت میں ہوتا ہو۔"

ہم نے کہا: "تمھارا مطلب یہ ہے کہ وہ انگریزی پڑھتی ہے اور تم نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ تم گاڑھا اور کھدر پہنتے ہو اور وہ ..."

کہنے لگے "بعض اوقات تم بچوں کی سی باتیں کرتے ہو میرے اور اس لڑکی کے درمیان یہی فرق ہے کہ میں آزادی کا شیدائی ہوں اور وہ غلامی کی دلدادہ جتنی چیزیں میرے لئے باعث نفرت ہیں وہ سب اس کے لئے باعث رغبت۔ مجھکو کھدر سے عشق ہے اور اس کو کھدر سے نفرت اب آپ ہی بتائیے کہ " چہ نسبت خاک را با عالم پاک "۔

ہم نے کہا۔ صحیح ہے۔ بجا ہے۔ درست "

کہنے لگے تو میں کیا کروں شادی کر کے ؟"

ہم نے کہا۔۔۔ لیکن شادی کرنے سے گویا تم قوم پرستوں میں ایک اور اضافہ کرو گے۔"

اچھل کر کہنے لگے۔ " وہ کیسے ؟"

ہم نے کہا۔ وہ اس طرح کہ اگر تم جمیلہ ہی سے شادی کر کے اُس کو اپنی راہ پر لگا لائے تو گویا تم نے رہنمائی کے فرائض انجام دیے، بجائے اس کے کہ جمیلہ کو اپنی ملکیت بنا کر اس کو اپنی مرضی کے مطابق بناؤ کیا تم یہ گوارا کرتے ہو کہ وہ کسی سرکار پرست فیشن ایبل کی بیوی بنے اور اس کی اصلاح نہ ہو سکے ؟

گردن ہلا کر بولے۔ "تم نے بات تو ایسی کہی ہے کہ میں قائل ہو گیا۔ مگر تم کو نہیں معلوم کہ وہ صاحبزادی کس ماحول میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ مجھ کو گویا ہیئت تبدیل کرنا پڑے گی۔ گویا عادتیں تبدیل کرانا پڑینگی مختصر یہ

کہ جمیلہ کو ایک سرے سے تبدیل کرنا پڑے گا لہٰذا میں ایسی ہی شادی کیوں نہ کروں جس کو تبدیل کرنا نہ پڑے "۔

ہم نے کہا تو پھر کمال ہی کیا ہوا ؟ کمال تو یہ ہے کہ ان ہاتھوں سے جو پیانو بجانے کے عادی ہیں چرخہ چلواؤ ان پیروں میں جو لمبی ایڑی کے جوتے میں رہ کر آہو خرامی کی مشق کر چکے ہیں چپل پہناؤ۔ اس جسم کو جس کی نزاکت ریشم کے بوجھ کی بھی بمشکل متحمل ہوتی ہے کھدر کا عادی بناؤ غرضکہ اپنے رنگ میں اس کو رنگ کر بجائے "میڈم" کے اپنی بیوی یعنی "شریمتی" بنا دو اگر تم اس میں کامیاب ہو گئے تو یاد رکھنا کہ تمہارا دل ایسا مطمئن ہو جائیگا گویا ہندوستان کو چاہے ملا ہو یا نہ ملا ہو لیکن تم کو سوراج مل گیا "۔

ایک وجدانی کیفیت کے ساتھ کہنے لگے۔ "یار سچ بتاؤ کہ آج تم اتنی معقول باتیں کیسے کر رہے ہو میں نے تو کبھی تمہارے متعلق اتنی اچھی رائے قائم نہ کی تھی جیسے تم آج ثابت ہوئے۔ اتنے زبردست دلائل ایسی سُلجھی ہوئی باتیں، اللہ اکبر بندے ماترم، بھارت ماتا کی جے، سبحان اللہ جی خوش ہوا، دل چاہتا ہے کہ تمہارے ایک ایک لفظ کو اپنا خط تقدیر بنا لوں میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں بالکل سچ سمجھو اور یقین جانو کہ میں صرف تمہارے ان الفاظ کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔ جمیلہ کے ساتھ نہیں اور سنو کہ میں اب شادی پر اور غیر مشروط شادی پر بالکل آمادہ ہوں

بلکہ اس سے بھی زیادہ جو تم کہو میں تیار ہوں۔"

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اپنی لسانی کی داد دوں یا مرزا کی بیوقوفی کی۔ بہرحال دونوں کو نصف نصف سمجھ کر میں اپنی کامیابی پر خوش ہوتا ہوا مرزا کے والد کے پاس پہنچا اور ان کو یہ مژدہ سنایا۔ وہ سنتے ہی میری طرف بڑھے۔ میں سمجھا کہ جذبات شکرگذاری سے مجبور ہو کر میرے قدموں پر گر پڑینگے میں ذرا پیچھے ہٹ گیا لیکن انھوں نے جھپٹ کر گلے سے لگایا اور دیر تک تعریفیں کرتے رہے۔ گھر میں خبر پہنچی تو مرزا کی والدہ نے دعا کہلا بھیجی اور خاصدان میں پان۔ غرضکہ اُس دن ہم ہی ہم تھے۔ ہر طرف سے مرزا کے نوکروں، چاکروں، ماماؤں، ملازماؤں، عزیزوں، رشتہ داروں کی انگلیاں ہماری ہی طرف اٹھ رہی تھیں اور ہم کو اس کامیابی پر محسوس ہو رہا تھا گویا خود ہماری شادی ہے۔ مرزا تو خیر جب دولھا بنیں گے دیکھا جائیگا لیکن اس وقت تو ہم کو یہ درجہ حاصل تھا۔

مرزا کی شادی کا تمام سامان پہلے ہی سے تیار تھا۔ بس مرزا کے "ہوں" کرنے کی دیر تھی جس کے بعد دعوت نامہ تقسیم ہونا شروع ہو گئے اور آخر وہ مرحلہ بھی طے پا گیا جس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ہماری خدمات حاصل کی گئی تھیں مرزا کو دلھن، مگر کھدر پوش، جمیلہ دُلھن ہی مگر بدیشی دلھن۔ لیکن مرزا کو قطعاً اعتراض نہ ہوا اس لئے کہ وہ سمجھے ہوئے

تھے کہ یہ کافر مسلمان ہو کر رہے گا چنانچہ ہنسی خوشی شادی کے تمام رسوم پورے ہوئے دُلھن رخصت ہو کر آ گئی اور مرزا کے مکان سے رفتہ رفتہ شادی کی فضائیں دور ہونے لگیں چوتھی ہوئی چالے ہوئے اور آخرکار مرزا کا مکان مہمانوں سے خالی ہو گیا۔ اس کے علاوہ کہ پہلے مرزا مردانے مکان میں رہتے تھے اب زنانے مکان میں رہنے لگے اور باقی حالات بدستور سابق ہو گئے۔

مرزا کے متعلق اتنا اندازہ تو ضرور ہوا کہ غیر مطمئن نہیں ہیں اس کے علاوہ وہ کچھ نہ کھلے اور نہ ہم نے پوچھا۔ اس لئے کہ ہماری حیثیت ایک ناصح مشفق کی تھی لہٰذا ہمارا خود سے سوال کرنا ذرا ہماری پوزیشن کے خلاف تھا لیکن ہمارا دل ضرور چاہتا تھا کہ بدیشی دلھن کے اس سودیشی دولھا سے پوچھیں تو کہ کیسی گذر رہی ہے؟ لیکن ہم منتظر تھے کہ یہ حضرت خود کچھ فرمائیں۔ آخر انھوں نے خود ایک دن فرمایا۔

"بھائی ہماری بیوی تو پکی نیشنلسٹ ہو سکتی ہے لیکن ابھی اُس کی ذہنیت کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔"

ہم نے کہا: "تو پھر تبدیل کر ڈالنا۔"

کہنے لگے: "ذرا صبر کرو۔ رفتہ رفتہ سب ہو جائے گا۔ دیکھئے گا مرزا کی بیوی کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔"

ہم نے کہا: "بات تو جب ہے کہ تم سے پہلے تمھاری بیوی جیل جائے"۔

کہنے لگے: "انشاء اللہ .... مگر نہیں یار خدا نہ کرے اس لئے کہ میں اس کو ذرا برا سمجھتا ہوں"۔

ہم نے کہا "اس میں برائی کیا ہے کیا قوم کے لئے قربانی عورت نہیں کر سکتی؟"

کہنے لگے: "یہ تو ٹھیک ہے مگر جیل کے داروغہ سے لیکر چپراسی اور سپاہی تک بلکہ تمام قیدی سب اس کے لئے نامحرم ہوں گے اور وہ ٹھہری پردہ نشین"۔

ہم نے کہا "واہ حضرت واہ! اگر محرم اور نامحرم کا امتیاز آپ نے بیوی کے معاملہ میں کیا تو کر چکے آپ قوم کی خدمت"۔

کہنے لگے: "بھائی تو بتاؤ آخر کیا کروں۔ خود تو میں جیل میں نہیں جہنم میں جانے کو تیار ہوں لیکن ...... لیکن ...... لیکن"۔

ہم نے کہا۔ "خیر معلوم ہو گیا کہ آپ بیوی کو قوم کی داسی نہ بننے دیں گے اچھا تو یہ بتاؤ کہ وہ تمھارے کھدر سے ناخوش تو نہیں ہیں؟"

کہنے لگے۔ "ناخوش تو خیر نہیں ہیں لیکن وہ چاہتی ہیں کہ میں ایک آدھ سوٹ بھی بنوا لوں تاکہ جب ان کی کوئی اسکول کی سہیلی یا اُستانی وغیرہ ان سے ملنے آئے تو وہ ایک سوٹ پہنے ہوئے شخص کو اپنا شوہر بتائیں ورنہ کھدر پہننے کی حالت میں ان کو ذرا پس و پیش ہو گا۔ بھائی بات اصل میں یہ ہے کہ خود ہماری بیوی نے ہمارے دردِ قومی کا احساس کر لیا تو کیا دنیا بھر ہمارے کھدر کو دیکھ کر ہم کو معزز آدمی سمجھے گی سب تو یہی سمجھیں گے کہ ہو گا کوئی جولاہا وغیرہ"۔

ہم نے کہا۔ "یہ تو یار تم غلط کہتے ہو اس وقت کھدر پہننا بھی ایک قسم کی عیاشی ہے جس کو بڑا آدمی بننا ہو وہ کھدر پہن لے۔ یوں سوٹ پہنو گے تو اس سے زیادہ قیمتی سوٹ پہنے ہوئے دوسرے بھی نظر آئیں گے لیکن جہاں تک کھدر کا تعلق ہے۔ ع "یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں اُلٹا سیدھا"

کہنے لگے: "مگر بھائی عورتیں ناقص العقل ہوا کرتی ہیں اُن کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آ سکتیں"۔

ہم نے کہا۔ "تو پھر ایک آدھ سوٹ بنوا لو وقت پر کام آئیں گے جس طرح ہم نے ایک آدھ کھدر کی شیروانی رکھ چھوڑی ہے"۔

کہنے لگے "ہاں بھائی بنوانا ہی پڑے گا لیکن دل نہیں چاہتا کہ اس چیز کو ہاتھ لگاؤں جس کو حرام سمجھ لیا تھا"۔

مرزا سے گفتگو کرنے کے بعد اس کا اندازہ تو ہم کو ہو ہی گیا تھا کہ اب یہ بہروپ بدلنے والے ہیں۔ لیکن ہم کو اُمید تھی کہ اگر اس دوران میں کوئی قومی جلسہ ہو گیا یا کسی لیڈر کا لکچر سننے کا مرزا کو اتفاق ہوا تو بہت ممکن ہے کہ رائے بدل جائے اس لئے کہ لیڈر تو لیڈر ہم ایسے غیر لیڈر نے ان کے اطوار میں کیسی تبدیلیاں پیدا کر دیں اور ہم تو ہم ایسے عورت ذات

نے کیسا ان حضرت کا ٹو پھیرا کہ اب ہر بات جو پہلے حرام تھی حلال ہو گئی ہے یا تو یہ اُمید تھی کہ یہ ذات شریف اس غریب لڑکی کو بھی جس کے کھانے پہننے کے دن ہیں اپنی طرح کھدر پوش بنا دیں گے۔ اور اگر زیادہ جوش آگیا تو ایک بدیشی ہولی میں بیوی کا تمام جہیز نذرِ آتش کر دیا جائے گا۔ لیکن وہاں تو دنیا ہی بدل گئی، دو باتیں جو اس نئی نویلی دُلہن نے کہیں تو میاں صاحب کی تمام "سودیشیت" رفو چکر ہو گئی۔ بڑے بڑے دعوے تھے بڑے ضدی بنتے تھے' اپنے عزائم پر بہت ناز تھا' باپ تک کی نہ سنتے تھے' یا اب یہ حال ہے کہ گویا بیوی نے کوئی جادو کر دیا۔ اگر بیوی بنگالن ہوتی اور پُرانا زمانہ ہوتا تو خیر کوئی تعجب نہ تھا اس لئے کہ وہاں کی عورتیں آدمیوں کو بیل بنا دینا بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتی تھیں لیکن یہاں تو نہ کوئی جادو تھا نہ سحر۔ یونہی سیدھے سادے الفاظ سے مرزا کو ایسا مجبور کیا گیا تھا گویا کھونٹے سے باندھ دیا ہو۔

مرزا کی جدید تبدیلی کے ہم منتظر تو ضرور تھے۔ لیکن یہ امید ہم کو کبھی نہ تھی کہ وہ ایک دن ہانپتے کانپتے ہمارے پاس آئے اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہنے لگے:۔

"ارے میاں اپنا وہ سرج والا سوٹ اور کالر چک ٹائی معہ رومال اور نائٹ کیپ جلدی سے دے تو دو۔"

ہم نے کہا: "اچھا ابھی لو۔ کیوں خیریت تو ہے؟"

کہنے لگے "آج تمہاری بھاوج کے اسکول میں جلسہ ہے جس میں میں بھی مدعو ہوں ..... لاؤ ٹائی باندھتا جاؤں اور کہتا جاؤں ورنہ دیر ہو گی .... ہاں تو وہاں میں بھی مدعو ہوں اور میرے سوٹ سب جل چکے۔ نئے ابھی تیار نہیں ہوئے لہٰذا مجبوراً تمہارا سوٹ پہن رہا ہوں ...... ارے یار قمیص بھی تو دو۔ واپس آکر ابھی بھیجے دیتا ہوں"۔

تھوڑی دیر میں ہمارے کھدر پوش شریمان مرزا جی یا رئیس الاحرار مولانا مرزا صاحب ایک باقاعدہ جنٹلمین نظر آنے لگے۔ ہم کو خیر اس انقلاب پر حیرت ہو رہی تھی لیکن مرزا نے آئینہ دیکھ کر کمال کر دیا۔ فرمانے لگے:۔

"بُرا تو نہیں معلوم ہوتا سوٹ میں میں سمجھا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد بُرا لگے گا۔"

اسراللہ
51 SABARMATI

دوست

کمبختی کی بھی متعدد قسمیں ہوتی ہیں اور کمبخت بھی مختلف اقسام کے ہوتے ہیں مگر آج تک ہماری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ ہم کس قسم کے کمبخت ہیں۔ بہرحال ہیں ضرور۔ اور یہ بھی طے ہے کہ کسی سخت مہلک قسم کے کمبخت ہیں ہمارے خیال میں سب سے زیادہ خطرناک قسم کمبختی کی خوش اخلاقی ہے۔ اور اتفاق سے اپنے خاندان بھر میں صرف ہم ہی خوش اخلاق ہیں۔ ہمارا خوش اخلاق ہونا ہمارے واسطے بلائے جان ہے بعض اوقات تو اس خوش اخلاقی سے تنگ آکر خودکشی کر لینے کو دل چاہتا ہے۔ مگر یہ سوچ کر کہ یہ بھی ایک قسم کا ایثار اور خوش اخلاقی ہوگی چپ ہو جاتے ہیں خدا گواہ ہے کہ ہم نے متعدد بار یہ بھی کوشش کی کہ ہم کسی طرح بہت بداخلاق بددماغ اور حد سے زیادہ کھرے آدمی بن جائیں۔ لیکن جب کبھی ہم نے اس عمل کا نتیجہ دیکھا کہ لوگ ہم کو

خوش اخلاق کے علاوہ صاف گو اور سچا بھی سمجھنے لگے۔ گویا ہماری کمبختی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ آخر کار مجبور ہو کر ہم نے گوشہ نشینی کی ٹھانی ہے وائے قسمت کہ اس میں بھی ناکامی ہوئی دو ہی روز چھپ کر گھر میں بیٹھے تھے کہ اہلیہ صاحبہ نے اپنی بے تکی بکواس اور بھدّے التفات سے ہمارے دماغ کو تقریباً آگرہ یا بریلی کے لئے موزوں کر دیا۔ اور ہم مجبوراً گھر سے باہر نکلے، باہر آنا تھا کہ پھر ہماری خوش اخلاقی اپنی بھیانک شکل لئے ہم کو نظر آئی اور ہم کانپ گئے بات اصل میں یہ ہے کہ خوش اخلاقی ایک قسم کا جوہر انسانی ہے لیکن جب حد سے بڑھ جائے تو بلائے ناگہانی ہونے میں ذرا بھی شک نہیں رہتا۔ لوگ اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر ہماری طرح کسی کا اخلاق وسیع ہو کر خدانخواستہ اس کا دائرہ احباب بھی وسیع کر دے تو اس شخص کو یا تو پھیپھڑے کی دق ہوتی ہے یا تھوڑے ہی دنوں میں دماغ خراب ہو جاتا ہے اور اگر اتفاق سے وہ شخص غیرت دار ہوا تو خودکشی کر کے مر جاتا ہے۔ مگر ہم اس کو کیا کریں کہ ہم کو ان تینوں باتوں میں سے ابتک کوئی بات نہیں ہوئی۔ دو تین مرتبہ "اکس رے" میں پھیپھڑے کی تصویر لوائی مگر پھیپھڑے بالکل صاف نکلے بلغم تو نکلتا نہیں صرف تھوک جو بہت کوشش کے ساتھ کھنکار کر نکالا جاتا ہے امتحان کرایا مگر دق کے جراثیم نہ نکلے غرضکہ سوائے خوش اخلاق کے اور کسی قسم کی بیماری بظاہر پیدا نہیں

بھئی اب رہا دماغ کا سوال ہمارے خیال میں ہمارا دماغ ابھی تک صحیح ہے ورنہ ہمارے تمام دوست جو آج ہماری خوش اخلاقی اور مروت کی تعریف کرتے ہیں ایک ایک ڈھیلا کھا کر ہم کو کب کے قبر کر چکے ہوتے لیکن دماغ کی خرابی غالباً شروع ہے اس لئے کہ ہمارے چار دوست ہیں الامان والحفیظ چار دوست ہیں چار یعنی ایک، دو، تین، چار۔ ان چاروں سے جب ہم علٰحدہ علٰحدہ ملتے ہیں تو ہماری کیفیت ہر مرتبہ نئی ہوتی ہے۔ مثلاً مرزا سے جب کبھی ملاقات ہوتی ہے تو ہمارا دل چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر بھاگ جائیں۔ وہ صاحب جب کبھی آجاتے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے گناہوں کی سزا ہم کو دنیا ہی میں مل گئی ہے اب خدا کے یہاں کا جھگڑا باقی نہیں رہا ظفر سے کبھی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو تھوڑی دیر کے بعد دماغ چکرا کر ہم پر غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور خدانخواستہ جب کبھی احسن سے ملاقات ہو جاتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم گویا دنیا میں نہیں ہیں بلکہ دوزخ کے داروغہ کے سامنے کھڑے کانپ رہے ہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ ان چاروں ملاقاتوں میں ہماری خوش اخلاقی کا مستقل مزاج ہونا ہمارے دوستوں کی عادتوں ہمت افزائی کر دیتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ملازم ہم کو خبر دیتا ہے کہ فلاں صاحب تشریف لائے ہیں تو ہم دل ہی میں آنے والے صاحب کو خوب گالیاں دیتے ہیں ان کے مرنے کی گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں۔ اور مری ہوئی

چال سے بالاخانہ سے اُتر کر اپنے ڈرائنگ روم میں آتے ہیں یہاں آتے ہی ہمارے لبوں میں ایک کھنچاؤ شروع ہو جاتا ہے اور نتھنے پھول جاتے ہیں ہمارے ہونٹ برابر دو حصوں میں تقسیم ہو کر آدھے پورب کی طرف کھنچ جاتے ہیں اور آدھے پچھم کی طرف۔ گویا اس طرح ہم زبردستی تبسم کی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور جیسے ہی تشریف لانے والے صاحب کا سامنا ہوتا ہے۔ بہت تپاک سے اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

"ارے بھائی آج عید کا چاند کدھر نکلا۔ کہاں کا راستہ بھول گئے
ع "آنکھیں ترس گئیں ترے دیدار کے لئے" وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان کمبختوں کو ہم اپنا دل کس طرح دکھائیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس سے ہمارے دل کی کیفیت بالکل متضاد ہے اور ہمارا دل یہی کہہ رہا ہے کہ یہ کمبخت اس وقت کہاں آمرا۔ خدا اس سے سمجھے ہم کس مزے میں نظم کہہ رہے تھے تیسرے بند کا چوتھا مصرع ذہن میں آیا ہی تھا کہ آپ نے آکر سب ستیاناس کر دیا۔ دل کی کیفیت خواہ کچھ بھی ہو مگر چہرے پر بدستور مسکراہٹ اور خوش اخلاقی کی تمام شانیں موجود ہیں۔ اس دو رنگی کی کیفیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ درد سر اور اختلاج شروع ہو جاتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس انتظار کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے کہ یہ حضرت کب تشریف لے جائیں گے۔

پرسوں رات کو وہ بارہ بجے تک شطرنج کھیلتے رہے جب بارہ بجے وہ تشریف لے گئے تو ہم ہارے تھکے بستر پر آئے مگر ان کے پیدا کئے ہوئے درد سر نے سونے نہ دیا۔ معلوم نہیں کس وقت آنکھ لگ گئی۔ آنکھ لگتے ہی خوفناک دوستوں کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے گویا سونے میں بھی خون خشک ہوتا رہا۔ بمشکل دو گھنٹے اس کیفیت میں گذرے ہوں گے کہ بیوی صاحبہ کی لخت جگر یعنی اُن کی بہت شوق سے پالی ہوئی بلی نے ہمارا منہ چاٹنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں اس بلی کو اس میں کیا لطف آتا ہے سورج نکلتے ہی ہم کو جگانا شروع کر دیتی ہے۔ اور اگر تھوڑی دیر اُس کے چاٹنے کی پروا نہ کریں تو وہ ہمارا منہ اس قدر صاف کر دے کہ پھر منہ دھونے کی ضرورت نہ پڑے غرضکہ ہم بیدار ہو گئے چائے پی اور "نیرنگ خیال عید نمبر" کے لئے افسانہ لکھنے بیٹھ گئے۔ بمشکل چھ سات سطریں لکھی ہونگی کہ کان کے پردے "جناب شوکت صاحب" کی گرجتی ہوئی آواز سے ہل گئے۔ جی میں آیا کہ اپنی بوٹیاں اپنے دانتوں سے نوچ ڈالیں۔ مگر کیا کرتے آخر نشستگاہ میں گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ جناب مرزا صاحب تشریف فرما ہیں۔ ہم نے عادت کے موافق آداب تسلیمات اور خوش آمدد کی بوچھار شروع کر دی مگر ڈر معلوم ہو رہا تھا کہ کہیں مرزا صاحب نے اگر باتیں شروع کر دیں تو

کل ہی ختم ہوں گی۔ ان حضرت کی باتوں کا سلسلہ جس قدر وسیع ہوتا ہے اسی قدر مہمل اور بےمعنی ہوتا ہے۔ اگر لکھنؤ سے شروع کریں گے تو بلا مبالغہ چین، جاپان، امریکہ، افریقہ غرضکہ تمام دنیا میں گھوم پھر کر اگر بس چلے گا تو آسمان تک پہونچ جائیں گے اور ان کی گفتگو میں مبتدا اور خبر کا کہیں پتہ نہ چلے گا۔ غرضکہ ہم مرزا صاحب کے پاس بیٹھ گئے، اور رات کے جاگنے کا قصہ اس لئے کہہ دیا کہ شاید ہم پر رحم فرمائیں۔ لیکن سچ ہے۔ ع "وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے" فرمانے لگے:۔

"بھائی شوکت بخدا تم سے مل کر تمام کلفت دور ہو جاتی ہے وہ انسان بھی کس قدر خوش قسمت ہے جس کو تم سے دوست ملیں۔ بخدا تم ہمہ صفت موصوف ہو انسان میں اگر وہ صفات نہیں ہیں جو تم میں ہیں تو پھر اس کا انسان ہونا یا حیوان ہونا بالکل یکساں ہے۔ ایک تم ہو اور ایک تم ہو اور ایک ورما ہیں زمین و آسمان کا فرق ہے اور ورما پر کیا منحصر ہے ان کے بڑے بھائی بھی عجیب آدمی ہیں جہاں ان کی شادی ہوئی ہے وہ لوگ بڑے رئیس ہیں مگر ویسے ہی کمبخت نیت کے خراب اور بھائی یہ تو کچھ غریب ہی کو خدا نے شرف بخشا ہے کہ اس کا دل غنی ہوتا ہے۔ ایوں یہ تو خدا کی مار ہے جتنا روپیہ ان کے پاس ہوگا اسی قدر ہوس میں زیادتی ہوگی۔ ایک ایک پیسہ پر جان جاتی ہے۔ چمڑی جائے دمڑی

دنیا کو چرپٹ کر گئی اب۔ دوسری دیکھئے کیا حشر بپا کرتی ہے۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔

یہاں تک تو مرزا صاحب کی گفتگو کو ہم نے سنا۔ مگر اب ہمارا دماغ چکرانے لگا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ مرزا صاحب نے اس کے بعد کیا کیا باتیں کیں تھوڑی دیر کے بعد ہم "ہوں" "ہاں صاحب" "بجا ہے" کرتے رہے مگر ایک لفظ بھی دماغ میں رکھنے کے قابل نہ رہا آپ خود انصاف فرمائے کہ ہمارا دماغ کس طرح صحیح رہ سکتا ہے کہ ہماری ثنا وصفت سے گفتگو شروع ہوتی ہے۔ جیکی کوگن کا ذکر آتا ہے امریکہ کا قصہ بیان ہوتا ہے۔ لندن پہونچتے ہیں۔ نئی جنگ پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور بعد میں نہ معلوم کہاں کہاں کے ذکر ہوئے ہوں گے کانوں سے آواز سن رہے تھے اور آنکھوں سے مرزا صاحب کے لبوں کی جنبش دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ بتانے سے قطعاً معذور ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ غرضکہ پورے دو گھنٹہ بیٹھ کر اس لئے چلے گئے کہ کھانے کا وقت آگیا تھا۔ ورنہ نہ جاتے۔ ان کے جانے کے بعد ہمارے دونوں ہاتھ خود بخود ہمارے سر پر آگئے اور ہم نے سر دبانا شروع کیا تسکین نہ ہوئی تو منہ دھو کر بالوں کو بھی تر کیا اور انندورا لگا کر بال درست کئے مگر اب بھی ہم اپنے قابو میں نہ تھے خیر اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہم باہر سے اُٹھ کر گھر میں آئے اور کھانا کھا کر

نہ جائے۔ اب اُس روز تم بائسکوپ گئے ہم سب ساتھ تھے۔ مگر اپنی ہمت دیکھو ایک احسن کو دیکھو لکھو پتی ہے۔ مگر ٹکٹ تم ہی نے سب کا خریدا بھئی واللہ کیا تماشا اس دن ہوا ہے۔ غضب خدا کا ٹانگ برابر کا چھوکرا جیکی کوگن اور وہ وہ کمال دکھائے ہیں کہ ہمارے باپ بھی نہ کر سکتے سچ تو یہ ہے کہ ہم ہندوستانیوں میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اب دیکھو یہ لڑکا اتنا مالدار ہے کہ اس کو روپیہ رکھنے کی جگہ بھی نہیں ملتی ہوگی اور ایک یہی کیا امریکہ والوں پر تو روپیہ کی بارش ہو رہی ہے۔ فورڈ کو دیکھئے غضب خدا کا روپیہ کی کوئی حد بھی ہے میں کہتا ہوں کہ میں اس قدر روپیہ دیکھ لوں جس قدر فورڈ کے پاس ہے تو میرا تو شاید دیکھ کر دم نکل جائے بھئی ہم تو مر کر ایک ارمان لے جائیں گے کہ ہم نے امریکہ نہیں دیکھا۔ دل تو چاہتا ہے کہ لندن کی بھی سیر کریں مگر امریکہ پر تو میں فدا ہوں لندن میں ایک بات ہے کہ وہ ایک ایسے حکمراں کا پایۂ تخت ہے جس کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ اور ہر سمندر اس کی سلطنت کے ساحلوں سے ٹکراتی ہے۔ اللہ اکبر کس قدر وسیع سلطنت انگریزوں کی بھی ہے اور واقعی بعض وقت تو میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ انگریزوں کی قوم بن کس طرح گئی؟ خدا کی تمام رحمتیں بس ان ہی پر نازل ہوتی ہیں مگر یار سنا ہے اب پھر جنگ ہونے والی ہے۔ ایک لڑائی تو تمام

چپ خاموش چارپائی پر لیٹ گئے اب بتائیے کہ جس غریب کو اتنا ستایا گیا ہو اور جو اس قدر تھک چکا ہو وہ بیوی صاحبہ کے سوالات کا جواب کس طرح دے سکتا ہے اور سوال بھی ایک دو نہیں لاکھوں سوال۔ کیوں طبیعت کیسی ہے کیوں لیٹ گئے خیر اس قسم کے سوالوں کا جواب تو بہت آسان ہے۔ مگر یہ سوال کہ مرزا سے کیا کیا باتیں ہوئیں۔ رہے سہے ہوش وحواس کو بھی کھو دیتا ہے۔ اور فانی کا مصرع یاد آتا ہے۔ ع "زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا"

اگر یہیں پر بس ہو جائے تو شکایت نہیں۔ واللہ ہم بڑے ضبط کے آدمی ہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خادمہ آ کر کہتی ہے کہ ظفر صاحب آئے ہیں۔ خدا گواہ ہو کہ جی چاہتا ہے کہ خادمہ سے لپٹ کر خوب چیخ چیخ کر رو دیں۔ اپنا سر دے ماریں۔ کوٹھے پر سے پھاند پڑیں۔ مگر نہیں خدا شاید ہمارے صبر کو آزمانا چاہتا ہے۔ ہم نہایت سکوت کے ساتھ اٹھتے ہیں اور باہر جا کر ظفر کے پاس بیٹھتے ہیں۔ ہماری خوبی قسمت ہو کہ ظفر کو خدا نے شاعر پیدا کیا ہے اور شاعر بھی ایسا جو نہایت بھیانک طریقے سے اپنا کلام پڑھ کر یہ سمجھتا ہو کہ میں بہت خوش گلو ہوں اور شاید ظفر کو سوائے ہمارے کوئی شخص کلام سنانے داد لینے کو نہیں ملتا ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر پھر بھی ہم کمبخت کے منہ سے نکل گیا کہ "بھائی ظفر کہو مزاج کیسے ہیں" بس پھر کیا تھا کہنے لگے۔

"بھائی پرسوں سے ایک منٹ کو بھی اگر سویا ہوں تو قسم لے لو کل مشاعرہ تھا۔ پرسوں مجھ کو مصرع طرح دیا گیا۔ میں نے پرسوں دن بھر کوئی فکر نہ کی رات کو شعر کہنا شروع کئے زمین اس قدر فرسودہ اور پامال کہ شعر ہی نہیں نکلتے خیر رات بھر غزل کہی اور کل دن بھر گھوڑ دوڑ میں رہے۔ رات کو مشاعرہ میں گئے۔ بھئی اس کو خود ستائی نہ سمجھنا اور واقعہ بیان کرتا ہوں کہ جس وقت پڑھنے بیٹھتا ہوں چھت اڑ گئی۔ داد دیتے دیتے لوگوں کی آوازیں پڑ گئیں اور میں پڑھتے پڑھتے تھک گیا۔ ایک ایک شعر کو دس دس بارہ بارہ مرتبہ پڑھوایا گیا اور پھر بھی لوگوں کو سیری نہیں ہوتی تھی اس مرتبہ غزل اس قدر کامیاب رہی کہ مجھکو خود تعجب ہے غرضکہ غزل ماحصل مشاعرہ سمجھی گئی۔ مگر بھائی بات تو یہ ہے کہ جب تک تم ایسے سخن فہموں کو غزل نہ سنا دی جائے محنت ٹھکانے نہیں لگتی۔ سنو یار مطلع عرض ہے ......"

ہمارے ظفر صاحب کی عادت ہو کہ دو مرتبہ ہر مصرع کو پڑھتے ہیں اور پھر دو مرتبہ پورے شعر کو پڑھتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ سننے والا کو ارشاد ضرور کہے۔ ہم بھی سبحان اللہ واہ واہ ماشاءاللہ مکرر ارشاد، غضب کا کہہ دیا ہے۔ کہتے رہے۔ اور پورے پورے ایک گھنٹہ کے بعد ان کے پندرہ شعر ختم ہوئے۔ اس کے بعد غزل کی تعریف پھر سے کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ مگر واہ رے ہم اس مشکل کو بھی آسان کیا۔ ظفر میں جہاں

سب خرابیاں میں یہ بات اچھی ہے کہ غزل سنانے کے بعد پھر نہیں ٹکتے فوراً چلے جاتے ہیں مگر اپنے ساتھ ہماری تمام یکسوئی کو بھی لے جاتے ہیں اور ان کے جانے کے بعد ایک گھنٹہ تک ہمارے کانوں میں ان کے پھٹے ہوئے بانس کی نغمہ سرائی گونجا کرتی ہے۔

ابھی پروگرام تین بجے تک ہو چکا ہے اور ساڑھے تین بجے احسن اور عمر آ کر بیٹھے بجے تک کم از کم اور زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک شطرنج ضرور کھیلتے ہیں۔ بارہ بجے جب ہم سوتے ہیں تو اکثر سوتے میں کہا کرتے ہیں "شہ بچے" "رخ اور ب میں" وغیرہ وغیرہ اور ہماری بیوی کو یہ سن کر بھی بجائے رحم آنے کے کہ یہ کمبخت دن بھر کا تھکا ہوا خواب میں بھی یہی دیکھ رہا ہے ہم کو چھیڑنے کی سوجھتی ہے جگا کر پوچھتی ہیں۔ کیا بک رہے تھے۔

اب تو ہم اس زندگی سے تنگ آ گئے ہیں۔ حکیم یوسف حسن صاحب لکھنؤ آ کر وعدہ لے گئے تھے کہ عید نمبر کے لئے فسانہ ضرور بھیجیں گے مگر حکیم صاحب کو کیا معلوم کہ ہم زندہ ہیں یا مرنے کے بعد والے عذابوں میں ابھی سے مبتلا ہیں حکیم صاحب دعا کیجئے کہ یا تو ہمارے یہ دوست ہم پر احسان کر جائیں یا ہمارا خاتمہ بالخیر ہو جائے۔ لیکن اگر ہماری خوش اخلاقی نے اللہ میاں کے یہاں بھی دوست پیدا کر لئے تو پھر کیا ہوگا ہ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خدا سر دے تو سودا دے

عاشق بننے کے لیے نہ بی اے ہونے کی ضرورت ہوتی ہے نہ ایم اے ہونے کی نہ صاحب جائداد کی قید ہے نہ شریف خاندان کی جس کو اللہ توفیق دے عاشق بن سکتا ہے اور جس طرح شیلے، شکسپیر، غالب، مومن، حافظ وغیرہ کا نام ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اسی طرح مجنوں اور فرہاد اور ان کی طرح دوسرے عاشق کا نام دس مرتبہ ایک غزل میں آنے کا قانوناً مستحق ہو جاتا ہے آخر مجنوں بھی آدمی تھا فرہاد بھی ہماری طرح انسان تھا ان دونوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے کہ آج تک ہر شاعر جب تک ان کا نام لے کر غزل شروع نہ کرے غزل کہہ ہی نہیں سکتا۔ نہ بہت پڑھے لکھے تھے نہ ایسے مالدار تھے نہ ان کے حسن میں کوئی خاص بات تھی بلکہ اگر سچ پوچھیے تو ان سے زیادہ پڑھے لکھے مالدار خوبصورت نہ سہی مگر خیر پھر بھی انسان کی صورت کے ہم خود ہیں

جب اُن لوگوں نے عشق کر کے ایسا نام حاصل کر لیا تو کیا ہم یہ بھی نہیں کر سکتے اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم سے اب دنیا کا کوئی کام نہ ہوگا..."

بڈھن کے ذہن میں اسی قسم کے خیالات کا ایک طوفان موجزن تھا اور وہ اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ سڑک پر لیٹا ہوا کتا بھی دکھائی نہ دیا کتے پر پیر پڑا اور اس کی "بھوں بھوں" نے تمام محویت کے نشہ کو ہرن کر دیا اُچھل کر ایک دُکان پر چڑھ گئے، خیریت ہوئی کہ کتے نے کاٹا داٹا نہیں لیکن اگر یہ حادثہ پیش نہ آ جاتا تو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ گھر پہونچتے پہونچتے بڈھن نہ معلوم کب کے عاشق بن چکے ہوتے۔ کتے پر پیر پڑ جانے سے خیالات پریشان ہو گئے، لیکن اس عاشق بن جانے کی اسکیم پر اطمینان سے غور کرنے کا ارادہ کر کے گھر پہونچے اور اچکن وغیرہ اُتار کر اسی فکر میں چارپائی پر لیٹ گئے۔ بڈھن اس مسئلہ پر جتنا جتنا غور کرتے تھے ان کی اُمیدیں بڑھتی جاتی تھیں اور ہر پہلو سے عاشق بن جانا اچھا ہی اچھا نظر آتا تھا، مگر پھر انھوں نے سوچا کہ لاؤ ذرا بیوی سے بھی مشورہ کر لیں ایک سے دو کی رائے مناسب ہوگی ممکن ہے کہ وہ کوئی بہتر بات بتا دیں بہر حال یہ ایک لاجواب ترکیب ہے اور بالکل الہامی طریقے سے ذہن میں آئی ہے بات یہ ہے کہ جب انسان کے دن پھرنے والے ہوتے ہیں تو خود بخود اس کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں یہ بھی کیا خدا کی قدرت ہے۔ دیکھیں بیگم

کیا کہتی ہیں؟

"سنتی ہو؟ ---- ارے سنا؟ ---- ذرا سنو تو سہی بیگم صاحبہ"

طلبی پر ہانڈی چولھا چھوڑ فوراً حاضر ہو گئیں اور بڈھن کے چہرے پر خلاف معمول تازگی اور چمک دیکھ کر خود بھی سوالیہ نشان بن گئیں کہ یہ کیا بات کہتے ہیں۔

بڈھن نے نہایت امید افزا چہرہ بنا کر کہنا شروع کیا۔

"ذرا قریب بیٹھو۔ آج ایک ترکیب سوجھی ہے۔ وہ لاجواب کہ واللہ تم بھی کیا کہو گی تم کہا کرتی ہو کہ تم سے کچھ نہ ہو گا یونہی بیکار بیٹھے رہو گے اور یہ اور وہ مگر آج دیکھو میں نے کیا ترکیب نکالی ہے"۔

بیگم:۔ "کہو گے بھی یا بس تمہیدیں ہی ہوا کریں گی میرا گوشت جلا جاتا ہے ابھی روٹی پکانے کو پڑی ہے"۔

بڈھن:۔ "اجی لعنت بھیجو گوشت کو اور چولھے میں ڈالو روٹی کو تم اطمینان سے سنو جو کچھ میں کہتا ہوں میں نے وہ ترکیب سوچی ہے کہ جب تک دنیا ہے میرا نام باقی رہے گا اور بڑے بڑے لوگ میرے نام کا وظیفہ پڑھیں گے"۔

بیگم:۔ "غضب ہے کسی طرح بات ختم ہی نہیں ہو چکتی"۔

بڈھن:۔ "سنو تو سہی تم تو بات کاٹ دیتی ہو بھلا تم نے مجنوں کا نام بھی سنا ہے"۔

بیگم:۔ "ہاں سنا ہے پھر؟"

بڈھن۔ "اگر اسی طرح میں بھی عشق کر لوں تو کہو کیسی رہے؟ ہزاروں لاکھوں برس تک لوگ مجھ کو نہ بھولیں گے۔ وہ شہرت ہو گی کہ تم بھی یاد کرو گی"۔

بیگم۔ "اے تمھیں خدا سمجھے ایسی عقل پر پتھر پڑیں۔ جو بات کی ہوئی اوندھی جان بوجھ کر اپنے کو سڑی بنا رکھا ہے۔ میری قسمت میں تمھارا ایسا خبطی لکھا تھا خدا اس سے تو مجھے موت دیدیتا۔ خدا میرے ماں باپ کی روح خوش کرے جنھوں نے میرا پلا ایسے سودائی سے باندھا ہے"۔

بڈھن۔ "ہائیں ہائیں۔ کچھ عقل ماری گئی ہے۔ کچھ پاگل ہو گئی ہو یعنی میں نے تو ایک اچھی بات کہی اسکی داد یہ ملی کہ سڑی سودائی اور نہ معلوم کیا کیا بنا ڈالا واللہ تم سے بھی بات کہہ کے طبیعت خوش نہیں ہوتی عجیب بیوقوف قسم کی عورت ہو۔ حالانکہ اپنا گوشت پکاؤ تم سے ایسی باتوں میں مشورہ لینا ہی میری حماقت تھی لاحول ولاقوۃ"۔

(۲)

حالانکہ بیوی سے سخت مخالفت ہو چکی تھی مگر بڈھن کا دل گواہی دے رہا تھا کہ عاشق بننا ہی اس کا ایک علاج باقی رہ گیا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہوا تو پھر ڈوب مرنا چاہیے خدا کی شان مجنوں اور فرہاد ایسے جاہل کندہ ناتراش عاشق بنیں اور بڈھن کچھ نہ بنے مگر جب تک یہ بات ذہن میں نہیں آئی تھی اسی وقت تک کی دیر تھی اب تو اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ عشق

کروں گا اور عاشق بن کر رہوں گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ عشق کرنے میں کم از کم ایک معشوق کی ضرورت ہوتی۔ وہ کہاں سے لایا جائے لیکن اس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ جب وہ عشق کرنے پر تیار ہو گیا تو خدا مسبب الاسباب ہے معشوق مل ہی جائے گا۔ ایک مرتبہ یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ لاؤ بیوی سے عشق کرلیں مگر پھر خود ہی اس خیال ہنسی بھی آئی کہ اپنی بیوی سے خود ہی عشق کرنا کس قدر مہمل بات ہے جیسے اپنا شعر پڑھ کر خود ہی سبحان اللہ کہہ دینا اور پھر خود ہی سلام کر لینا یا اپنی دعوت خود ہی کرنا اور خود ہی مدعو ہو جانا۔ عشق بیوی سے نہیں کیا جاتا بیوی سے تو نکاح ہوتا ہے اور عشق ہوتا ہے معشوق سے۔ لہٰذا یہ عشق کا قصہ اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا جب تک کوئی مناسب سا معشوق نہ ملے اور معشوق کی جستجو شروع کر دی۔ جستجو جس چیز کی بھی کی جائے اس کا نہ ملنا کیسا؟ ہاں ڈھونڈھنے والا چاہیے۔ بدھن نے معشوق کی جستجو میں سارا شہر چھان مارا۔ کوئی گلی کوئی کوچہ نہ چھوڑا آخر کار معشوق مل کر رہا لیکن ذرا گھر سے دور۔ خیر اس سے کیا ہوتا ہے عشق کے نزدیک فاصلہ واصلہ کوئی چیز نہیں مجنوں تو نجد کے معلوم نہیں دن بھر میں کتنے چکر لگاتا تھا اور ذرا بھی نہیں تھکتا چہ جائیکہ اتنا سا فاصلہ کہ چار پیسے دیے اور کھٹ سے یکے پر بیٹھ کر کوچۂ جاناں میں جا پہنچے۔ تھوڑی دیر عشق کیا اور پھر واپس آ گئے

دو تین روز تک بدھن اسی طرح آتے جاتے رہے لیکن ابھی ان کو عشق کرنا نہیں آتا تھا۔ آخر ایک دن غور کیا کہ عشق کس طرح کریں معشوق بھی خدا کے فضل سے مل گیا ہے اور عاشق بھی، ہم ہیں عشق کرنے کا طریقہ تو معلوم ہونا چاہیے۔ یہ سوچ کر قصۂ لیلیٰ مجنوں شروع سے آخر تک رات بھر میں پڑھ ڈالا اور نہایت غور سے پڑھا صبح ہوتے ہی گھر سے نکل کر اپنے بیٹھکے میں آئے اور عاشق کی صورت بنانا شروع کی، اچکن اتاری قمیص کو پھاڑ کر پھینکدیا، صرف گریبان گلے میں ڈال لیا پاجامے کو لنگوٹی کی شکل میں پھاڑ کر باندھ لیا اور ننگے سر ننگے پاؤں گھر سے نکل کر لیلیٰ کی تلاش میں چلے، لیکن کوئی یکہ والا بٹھانے پر راضی نہ ہوا ایک آدھ سے لڑائی بھی ہو گئی یہ لاکھ کہتے رہے کہ "ابے جانتا نہیں ہے کہ ہم عاشق ہیں" لیکن کسی نے ایک نہ سنی ہر کوئی ہنستا کوئی مذاق اڑاتا رہا۔ بہرحال سب نے متفقہ طور پر پاگل سمجھ کر انکو یکہ پر نہ بٹھایا اور مجبوراً بیچارے کو پیدل جانا پڑا۔ راستہ میں کتے بھونکے۔ لڑکوں نے ڈھیلے مارے لوگوں نے مذاق کیا، لیکن یہ اپنی دھن میں سیدھے کوچۂ یار میں آکر ٹھیرے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آج کچھ کچھ عشق رنگ لایا ہے اس لئے کہ مجنوں پر بھی شروع شروع میں کتے بھونکے تھے اور یہی تمام واقعات گذرے تھے جب عشق کے رنگ لانے کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو معشوق کی کھڑکی

کے نیچے پہونچے اور اظہار عشق کا عزم بالجزم کر لیا ایک کوئلے سے کاغذ پر لکھا ؎ "مرتا ہوں ترے عشق میں اے یار خبر لے" لکھا اور کاغذ کو ایک پتھر میں باندھ کر سیٹھ جی کی لڑکی پر پھینک دیا۔ کاغذ تو ہوا سے اُڑ گیا۔ لیکن پتھر پیغام عشق لے کر سیدھا پیشانیٔ معشوق پر جا کر اس طرح لگا کہ خون شروع ہو گیا اور "ہائے مار ڈالا" کی ایک آواز سے سارا مجمع جمع ہو گیا۔ بدھن معشوق کی ان اداؤں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ معشوق کی انگلی کے ایک اشارے سے چار پانچ آدمیوں نے عاشق کو گرفتار کر لیا۔

(۳)

پولیس کی چوکی بھی عجیب و غریب جگہ ہوتی ہے اور پھر ایک عاشق کے لئے وہاں کسی بات میں شعریت ہی نہیں بس "ابے تبے" کر کے معاملات کی باتیں پوچھ لیں اور حوالات میں بھیج دیا نہ کسی کے احساسات کا خیال نہ لطیف جذبات کا پاس۔ بس ان کو تو اپنے کام سے کام ہوتا ہے بدھن کو بھی وہاں جا کر قلبی اذیت ہوئی جس کو دیکھئے "ابے تو کون ہے کہاں رہتا ہے کیا نام ہے؟ تو نے کیا کیا؟ بولتا ہے کہ نہیں؟ یہی کہہ رہا ہو اب کوئی ان سے کیا کہے کہ جس سے تم اس طرح مخاطب ہو وہ کس مرتبہ کا انسان ہے۔ ایک آدھ مرتبہ بدھن نے کہا بھی کہ "بھائی ہم عاشق ہیں عاشق" مگر اس پر کسی نے کان بھی نہ دھرے بس یہی پوچھا کئے "عاشق علی" یا عاشق

حسین؟" اب اُن کو کون سمجھاتا کہ عاشق کے لئے صرف عاشق کہہ دینا ہی کافی ہے۔ جب اُن کا اس طرح اطمینان نہ ہوا تو کہا کہ "بھائی ہم عاشق ہیں ہمارا نام بدھن ہے"۔ کسی نے سن کر کہا "سڑی ہے" کوئی بولا "بنتا ہے" کسی نے رائے قائم کی کہ "بدمعاش ہے" کسی کا خیال ہوا کہ "خفیہ پولیس ہے" ایک لال بجھکڑ نے بہت غور کے بعد کہا کہ "انقلاب پسند جماعت کا آدمی معلوم ہوتا ہے، بم باز ہے" آخر ایک صاحب نے گھر کا پتہ پوچھا تو بتا دیا گیا۔ انھوں نے کہا ہم ابھی چلیں گے ہم کو چل کر اپنا مکان بتاؤ۔ بدھن نے کہا "بسم اللہ چلئے آپ کا گھر ہے"۔

پولیس کے سپاہیوں میں گھرے ہوئے بیچارے بدھن اپنے گھر پہنچے مگر گھر میں نہ جانے پائے۔ بیوی کو خبر ہوئی تو اس نے سر پیٹ لیا محلہ والوں نے شناخت کی اور سب نے متفقہ طور پر یہی رائے دی کہ "بیچارہ اچھا خاصہ تھا آج ہی دماغ خراب ہو گیا" بیوی نے کہا "نہیں دماغ میں کل شام سے کچھ خلل ہے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں مجنوں کی طرح عشق کر کے نام کروں کیا رائے ہے . . . ."

بیوی کی آواز سن کر بدھن کو پھر غصہ آیا اور کہنے لگے :-

"پاگل ہو تم تمھارا کیا؟ یہ دماغ کی خرابی کی بات ہے یا نام پیدا کرنے کی ترکیب ہے؟ تم نے کل بھی جہالت کی باتیں کی تھیں اور آج بھی وہی حماقت

تم سے کون پوچھ رہا ہے تم جاؤ کھانا پکاؤ، کسی کا کیا اجارہ ہے۔ ہم نے عشق کیا اچھا کیا، خوب کیا، اور کریں گے، ہزار مرتبہ کریں گے دیکھیں تو ہمارا کیا کرتی ہو؟"

بیوی:۔ "اے اپنی گت تو دیکھو، ہائے میں لٹ گئی۔"

بڈھن:۔ "گت کیا دیکھیں، عاشقوں کی یہی شان ہوتی ہے تم تو ماشاءاللہ پڑھی لکھی ہو، ذرا قصہ لیلیٰ مجنوں اٹھا کر دیکھو کہ مجنوں جس کا آج ڈنکا بج رہا ہے کس شان سے رہتا تھا۔"

بیوی:۔ "ہائے میں لٹ گئی، ہائے میں کہیں کی نہ رہی۔"

بڈھن:۔ "اس میں لٹنے کی کونسی بات تھی ایک قمیص میں نے اپنے شوق کے لئے پھاڑ ڈالی تو تم لٹ گئیں۔ تم کو میرا عشق اتنا ہی برا معلوم ہوتا ہے تو جانے دو میں نہیں کروں گا عشق، لاؤ کرتا پاجامہ بکس میں سے نکال دو، مگر اب مجھ کو بیکاری کا طعنہ نہ دینا۔"

شاعر اور شاعری

یہ نہ سمجھئے گا کہ ہم خدانخواستہ شاعر نہیں لیکن اس شاعر ہونے سے تو ناشاعر ہونا اچھا تھا۔ آج تک ہم اپنی اور اپنے قسم کے دوسرے انسانوں کی فطرت کو خود نہیں سمجھ سکے کہ ہم لوگوں کے دماغ میں کونسی خرابی ایسی ہو جاتی ہے جس سے ہم شاعر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جہاں تک مصرع موزوں کرنے اور ایک مصرع پر دوسرا مصرع لگانے کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعری ایک مستقل فن ہے اور شاعر کچھ بھی ہو لیکن اس فن کا ماہر ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کامل ہونے کے بعد دوسرے علوم و فنون کے ماہر تو چاہے صرف سنک جاتے ہوں لیکن شاعر کا دماغ دنیا کی نقطۂ نظر سے قطعاً قابل رحم ہو جاتا ہے۔ اسکی دنیا ہی دوسری ہو جاتی ہے وہ آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر خود بخود گردن ہلاتا ہے اشارے کرتا ہے ہنستا ہے

مسکین چہرہ بناتا ہے، اکڑ جاتا ہے، غضبناک ہوتا ہے، مظلوم صورت بناتا ہے مختصر یہ کہ اس کو جو کچھ بننا ہوتا ہے اکیلا بیٹھا بجائے خود بنا کرتا ہے اور لوگ اس کو دیکھ کر ہنستے ہیں۔ افسوس کرتے ہیں اور خدا سے توبہ کرتے ہیں کہ جو جس کو چاہے بنا دے۔ اب تو شاعروں کی کثرت سے یہ حال ہو گیا ہے کہ جہاں کہیں راستہ گلی میں کوئی عجیب الخلقت انسان نظر آیا اور اسکی وضع قطع میں مخبوط الحواسی کے آثار پائے گئے۔ بس اس کے متعلق بغیر کہے سُنے شاعر ہونے کا یقین اس طرح کر لیا جاتا ہے گویا اس قسم کی شکل وصورت کے انسان کا شاعر ہونا برحق ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ تحقیقات کے بعد وہ حضرت یا تو شاعر نکلتے ہیں ورنہ انیسر فی ضرور برآمد ہوتے ہیں۔ اور اگر ان دونوں میں سے کوئی نہیں ہوتے تو ان کا انسان ہونا ذرا مشکوک ہو جاتا ہے۔

معلوم نہیں اس شاعری میں کونسی ایسی نحوست ہے کہ ہزار دو ہزار آدمیوں میں ایک شاعر دور سے پہچانا جاتا ہے۔ نحوست ہوتی تو ضرور ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ شاعری منحوس ہے ہماری زیادتی ہوگی ہم چاہے شاعر ہوں یا نہ ہوں، لیکن کہیں گے صاف صاف خدا لگتی چاہے شاعر ہوں یا نہ ہوں، لیکن کہیں گے صاف صاف خدا لگتی چاہے کوئی برا مانے یا خوش ہو کریم کبھی سر اقبال کی قسم کا سر شوکت شاعر بنا دے

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ حضرت شاعری کو منحوس نہیں کہا جا سکتا بہت ممکن ہے کہ شاعری کبھی منحوس ہستی ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس فن لطیف کو منحوس حضرات کا طبقہ اختیار کرتا ہو اور اُن ہی حضرات کے فیض سے ہماری شاعری میں نحوست آ جاتی ہو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس شاعری کے باوا آدم یعنی دنیا کے سب سے پہلے شاعر کچھ عجیب غریب قسم کے انسان تھے جنہیں وہ تمام خوبیاں جو آج تمام دنیا کے شاعروں میں تقسیم ہو گئی ہیں، یکجائی طور پر موجود تھیں۔ مثلاً کبھی نہ بنی ہوئی حجامت، کبھی نہ کٹے ہوئے ناخن کبھی نہ منجھے ہوئے دانت کبھی نہ دُھلا ہوا رُخ روشن کبھی نہ بدلے ہوئے کپڑے اور پھر ان کپڑوں کے زیب تن کرنے کی یہ شان کہ ٹانگوں میں کرتہ پہن لیا ہے تو خوش، گلے میں پاجامہ ڈال لیا ہے تو خوش داہنے پیر کا جوتا بائیں پیر میں ہے اور بائیں پیر کے جوتے کی جگہ کسی کی کھڑاؤں مل گئی ہے۔ مختصر یہ کہ کوئی تک ہی نہیں وہ تو کہئے کہ خود انگریزوں کے یہاں بھی شاعر پیدا ہو گئے تھے ورنہ یہ ہندستان کے تمام پاگل خانے ہمیشہ آل انڈیا مشاعرہ بنے رہتے۔ مگر صاحب جہاں تک غور کیا ہے یہ شاعری کی آن بان شان انگریز شاعروں میں تو ہے ہی نہیں معلوم نہیں وہ لوگ پاؤں میں پتلون اور ہاتھوں میں کوٹ پہننے کے بعد بھی کس طرح شاعر بنے رہتے ہیں، مگر دیکھئے نا کہ وہی فرق ان کی شاعری

میں بھی ہے کہ نہ ہجر و وصال ہے نہ گل و بلبل نہ زلف و شانہ ہے نہ صیاد و گلچیں بس یہ کہہ دیا کہ "ہوا کو کس نے دیکھا ہے نہ میں نے نہ تم نے، لیکن جب درخت اپنی گردن جھکا لیتے ہیں تو ہوا گذرتی ہوئی ہوتی ہے" سبحان اللہ کیا شعر فرمایا ہے کہ "مکرر ارشاد" کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ اب تو غالباً یہ فیصلہ نامناسب اور غیر منصفانہ نہ ہو گا کہ انگریزوں کے یہاں کی شاعری منحوس ہے اور صاف کیجئے گا کہ ہمارے یہاں کے . . . . اچھا ہم کچھ نہیں کہتے ورنہ ہماری برادری والے سب خفا ہو جائیں گے اور کوئی مشاعرہ کا کارڈ بھی نہ بھیجے گا۔ حالانکہ ہم موجودہ دور کے شعراء کے متعلق تو کچھ لکھ ہی نہیں رہے ہیں۔ اس لئے کہ آج کل کے تمام اُردو شعراء ہر حیثیت سے انگریزی شاعروں کی طرح ہو گئے ہیں اور ان میں وہ شان ہی باقی نہیں رہی ہے جو مشرقی شعراء کے لئے مخصوص تھی بس آدھ نمونے نظر آ جاتے ہیں جن کے بعد مشرقی شاعروں کی اصلی شکل و صورت کا تو بس خاتمہ سمجھنا چاہئے اگر ہم موجودہ دور کے شعراء کے متعلق کچھ لکھتے تو سب سے پہلے ہم کو کم از کم اخلاقاً یہ چاہئے تھا کہ اپنے کو منحوس عجیب الخلقت، مخبوط الحواس وغیرہ فرض کرتے لیکن ہم یہ فرض کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں اور اگر فرض کر لیں تو یہ ہماری منکسر مزاجی ہو گی لیکن عوام کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے معلوم نہیں وہ ہم کو بھی شاعر سمجھ کر کیا سمجھ بیٹھیں۔

اس زمانہ کے شاعر لاکھ گئے گذرے سہی مگر پھر بھی شاعر ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلے شعراء کے یہاں حقہ کا پانی تبدیل کرنا کفر تھا تو اب جائز ہے کہ سال دو سال کے بعد اگر بدل دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ پہلے شاعروں کے یہاں حجامت کی مد ہی غائب تھی، لیکن اب برس چھ مہینہ میں حجاموں کو کچھ نہ کچھ ان لوگوں سے بھی مل جاتا ہے مختصر یہ کہ بہت انقلاب ہو چکا ہے بس اب اس کو حد سمجھئے کہ بہت سے شاعر سوٹ تک پہننے لگے ہیں اور اس کے باوجود "علامہ" "سر" اور اسی قسم کے موٹے موٹے بڑے بڑے خطابوں والے شاعر ہیں لیکن جہاں تک شاعرانہ اداؤں کا تعلق ہے وہ سب ان فیشن ایبل شاعروں میں بھی موجود ہیں واللہ آپ کو یقین نہ آئے گا کہ یہ بظاہر صاحب بہادر بنے ہوئے لوگ جس وقت تنہائی میں مصرع پر مصرع لگانے بیٹھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی سخت قسم کا دورہ اٹھا ہے، اور معلوم نہیں ان پر کیا تکلیف گذر رہی ہے غور و فکر کی حالت میں ہر شخص کے چہرے پر اُتار چڑھاؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن ان لوگوں کے چہرے پر تو وہ اُتار چڑھاؤ کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو نشیب فراز کہا جائے مد و جزر کہا جائے یا جوار بھاٹا، عام طور پر متین سے متین انسان آئینہ دیکھنے کے وقت اور بچوں کو کھلانے کے وقت عجیب مضحک شکل کا انسان ہو جاتا ہے اور عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے لیکن شاعر شعر کہتے وقت سب کو

مات کر دیتا ہے کبھی گردن ٹیڑھی کر کے آنکھیں چھوٹی کئے اس طرح بیٹھتا ہو گویا اب جھپٹے گا۔ کبھی اچھے خاصے چہرے میں سینکڑوں شکنیں پیدا کر کے اس طرح ہاتھ اُٹھاتا ہے گویا نہایت بیدردی سے روح قبض کرنے کا ارادہ ہے۔ کبھی آہ سرد بھر کر اس گردن لٹکا لیتا ہے کہ دیکھنے والے کا بھی کلیجہ پھٹ جائے کبھی آسمان کو اس حسرت ویاس سے دیکھتا ہے کہ اگر ہم آسمان ہوتے تو یقیناً ہٹ جاتے۔ کبھی گردن ہلا کر اپنے زانو اس طرح پیٹتا ہو کہ گویا کسی مہیب انتقام کا ارادہ کر چکا ہے۔ کبھی آنکھیں نکال کر اس غصہ سے زمین کو دیکھتا ہے کہ اگر کسی انسان کو دیکھ لے تو اس کا بچنا مشکل ہو جائے کبھی سر پہ ہاتھ رکھ کے اس طرح آنکھیں بند کر لیتا ہو گویا ایک حسین بیوہ اپنے مرحوم شوہر کے خیال میں کھو گئی ہے۔ کبھی مسکرا کر اس طرح پہلو بدلتا ہے کہ ہزار جان سے عاشق ہو جانے کو جی چاہتا ہے کبھی اپنی نگاہوں کے ساتھ انگلیوں کو وہ بیمعنی جنبش دیتا ہے جس کو شاید "سا رے گا ما پا دھا نی" کے ماہر اور ہارمونیم وغیرہ کے اُستاد سمجھ سکیں ہم تو کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ غرضکہ ایک غزل کہنے میں اس کا چہرہ اسقدر مختلف رنگ بدلتا ہے کہ دیکھنے والے کی نگاہوں کے سامنے ہر شکل صورت کے مردوں عورتوں چرندوں، پرندوں اور درندوں کی زندہ تصویر پھر جاتی ہے اور وہ شاعر کے چہرے میں کائنات کو متحرک دیکھتا ہے۔

شعر کہنا دراصل ایک قسم کی ورزش ہے اور شعر پڑھنا تو کسی طرح کشتی لڑنے سے کم نہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت کوئی شاعر مشاعرے میں اپنی غزل پڑھنے جاتا ہے۔ اسکی ایک ایک ادا اُس کے ان کی سی ہوتی ہے جو دنگل میں کشتی لڑنے جا رہا ہو اور جب مشاعرہ میں اس کے پڑھنے کی باری آتی ہے تو وہ بالکل اس طرح پینترا بدل کر بیٹھتا ہے گویا ایک دیوزاد قوی ہیکل رستم زماں پہلوان لنگوٹ کس کر "یا علیؑ" کا نعرہ بلند کر کے اکھاڑے میں آگیا ہو جب وہ غزل شروع کرتا ہے تو اس کے ساتھی "سبحان اللہ" اور "مکرر ارشاد" کا شور غل بھی اس طرح مچاتے ہیں جس طرح دنگل میں ہر پہلوان کے طرفدار "مار گٹا مار" اور "مچھلی غوطہ" وغیرہ کی آوازیں بلند کرتے ہیں اور شاعر بھی اپنی غزل ایسے ایسے داؤں پیچ سے پڑھتا ہے کہ اس کے بعد پڑھنے والے کو نئے پینترے ایجاد کرنے کی فکر ہو جاتی ہے۔ مشاعرہ میں اگر کوئی شخص بحیثیت ایک ناشاعر کے شریک ہو اور صف سامعین میں بیٹھ کر یہ تماشا دیکھے تو اسکو ایک خاص لطف حاصل ہوگا ہر شاعر کے انداز الگ آواز الگ، وضع قطع الگ، پڑھنے کا طریقہ الگ، بھاؤ بتانے کی ادائیں الگ وہ تو کہئے کہ مصرع طرح دیدیا جاتا ہے جس سے ردیف اور قافیہ بحر وزن ایک ہی ہو جاتا ہے ورنہ سب الگ ہی الگ ہو جاتا۔ البتہ بہت سی مخصوص باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر شاعر میں یکساں ہیں اور جو ہر مشاعرہ میں

دیکھی جاسکتی ہیں اور اُن ہی چند علامتوں سے عام انسان اور شاعر میں امتیاز ہو سکتا ہے۔ مثلاً غزل پڑھنے سے پہلے یہ جھوٹ بولنا کہ غزل نہیں کہی ہے پھر اس جھوٹ کو قسمیں کھاکر سفید جھوٹ بنانا۔ بہت زیادہ اصرار پر اتنا تو کہنا کہ جو دو تین شعر کہے ہیں وہ ردی ہیں اور پڑھنے کے قابل نہیں پھر منکسر مزاجی سے کہنا کہ جو حضرات پڑھ چکے ہیں اُن کے بعد پڑھنا منہ چڑھانا ہے اور آخر کار مجبور ہو جانے کے انداز سے وہی دو تین شعر اس طرح پڑھنا کہ ایک دم سے پندرہ بیس پچیس پڑھ جانا اور بیچ بیچ میں یہ کہتے جانا کہ "آج ہی طرح معلوم ہوئی تھی شعر کیا کہے ہیں، بکے ہیں" لیکن اسی پر داد کا طالب ہونا۔ اسی قسم کی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر شاعر میں یکساں ہیں اور اگر کسی میں نہیں ہیں تو اُس کو لوگ اناڑی، مبتدی، یا مغرور سمجھتے ہیں لیکن آجکل کے شاعر جن کو نئی روشنی کے شاعر کہا جاتا ہے ان باتوں سے علیٰحدہ رہ کر زیادہ تر اناڑی ہیں اور کیا کہیں کہتے ہوئے شرم آتی ہو کہ اُن ہی اناڑیوں میں ہمارا بھی شمار ہو کہ غزل کسی تمہیدی عذر کے شروع کر دیتے ہیں اور مولوی محمد اسمٰعیل مرحوم کی اُردو ریڈر کے آموختہ کی طرح رواں سناکر ختم کر دیتے ہیں۔ یہ بھی کوئی شاعری میں شاعری ہے کہ معلوم ہوتا ہے سبق سنا رہے ہیں اور سننے والے شاباش شاباش کہہ رہے ہیں۔

ہم نے پہلے یہ تجویز پیش کی تھی کہ خیر ان 'میر' غالب' آتش ناسخ

وغیرہ تو یونہی چل بسے لیکن دورِ حاضرہ کے مشاعروں کی ریکارڈنگ ہو جائے تاکہ کم از کم ان کی آواز اور ان کے پڑھنے کا طریقہ ہی اُن کے بعد باقی رہے اور آیندہ پیدا ہونے والے شاعر گراموفون کی مدد سے گذرے ہوئے شعرا کا کلام ان کی زبان سے سُن کر اس کمی کو محسوس کریں کہ خدا جانے شوکت کس طرح پڑھتے تھے اور اُن کی آواز کیسی تھی لیکن جب سے ہندوستان میں بولنے والے فلم آئے ہیں ہماری رائے بدل گئی ہے اور اب ہم یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ ہر شاعر کا ایک بولنے والا فلم ہو۔ یہ فلم آج تو کچھ بھی نہیں لیکن سو برس کے بعد ایسی قیمتی چیز سمجھے جائیں گے کہ فلم کمپنی کو منہ مانگی قیمت ملے گی۔ آج اگر ہم یہ چاہیں کہ ہمارے مشاعرہ میں سودا، ذوق غالب وغیرہ میں سے کوئی شریک ہو جائے تو ہماری اس خواہش کو سڑی پن سمجھا جائے گا لیکن اب سے سو برس کے بعد اگر کوئی صاحب مشاعرہ اپنے مشاعرہ میں ہم کو شریک کرنا چاہے گا تو ہم سفید چادر پر بالکل اسی طرح متحرک نظر آئیں گے جس طرح آجکل مشاعروں میں نظر آتے ہیں۔ ہماری وہی آواز ہوگی وہی نقل و حرکت ہوگی وہی شکل و صورت اور اگر لوگ ہم کو چھونے ہم سے بات کرنے ہم کو پان دینے ہمارے آگے حقہ بڑھانے کی کوشش نہ کریں گے تو ہم بالکل وہی ہوں گے جو آپ ہیں۔ اسوقت کے لوگ ہم کو دیکھ کر اندازہ کریں گے کہ پہلے شعر کس طرح پڑھے جاتے تھے پڑھنے والا کس طرح بیٹھتا تھا کس طرح منہ کھول کر پڑھتا تھا کس طرح ہاتھ اُٹھاتا تھا کیسا منہ بناتا تھا اور کس طرح

داد قبول کرتا تھا۔ ایک ہم ہیں ہم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ غالب مرحوم منہ کھول کر پڑھتے تھے یا نیز بت کرکے۔ کھڑے ہوکر پڑھتے تھے یا بیٹھ کر پڑھنے میں تان لگاتے تھے یا گٹکری لیتے تھے بس ان کا دیوان دیکھ لیا ہے اُن کی خاموش تصویر دیکھ لی ہے اور اس طرح مطمئن ہیں گویا غالب سے مل لئے۔

دنیا کے ساتھ ساتھ شاعر بھی رنگ بدل رہے ہیں جو حالت شعرا کی پہلے تھی وہ اب نہیں ہے اور جو اب ہے وہ کچھ دن بعد نہ ہوگی ہم کو تو کچھ ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد عام انسانوں اور شاعروں میں مشکل سے امتیاز ہو سکے گا۔ ابھی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اُن سے تو بس یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تھوڑے دنوں میں ہر قسم کے انسان شاعر ہونے لگیں گے پہلے یہ ہوتا تھا کہ ایک شاعر دنیا کے اور کسی کام کا نہ رہتا تھا اس کو دن رات مصرع کے اوپر مصرع یا مصرع کے نیچے مصرع لگانے کی ایسی فکر ہوتی تھی کہ دنیا کے دوسرے کام کیسے کھانا پینا تک دشوار ہو جاتا تھا ہم نے خود اپنی آنکھوں سے اس قسم کے شاعروں کو دیکھا ہے کہ چوک میں دیکھا ہے کہ چوک میں کمربند باندھتے چلے جارہے ہیں اور اُن کو مطلق خبر نہیں کہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں اور اگر وہ اتنے ہی باخبر ہو جاتے کہ ہم چوک میں ہیں یہاں ہم کو کمربند باندھنا چاہیے تو پھر وہ شاعر ہی نہ رہتے۔ بس وہ تو اپنی دُھن میں منہ اُٹھائے کمربند ہاتھ میں لئے چلے جارہے ہیں اب اُن کو ہوش اُس وقت آئے گا

جب مصرع پر کوئی پھڑکتا ہوا مصرع لگ جائے گا اور اُس کے بعد فوراً دل چاہے گا کہ یہ شعر کسی کو سنا کر داد حاصل کرلیں اس لئے کہ بغیر اس شعر کی داد حاصل کئے وہ دوسرا شعر نہیں کہہ سکتے۔ اس وقت وہ اپنا کمربند بھی آدمیوں کی طرح باندھیں گے۔ سنبھلیں گے اور کسی کو راستے میں پکڑ کر کہہ دیں گے کہ "دیکھنا بھائی تیرے لئے یہ شعر ابھی کہا ہے۔ جب شعر سنالیں گے اور داد مل جائے گی تو پھر آگے بڑھیں گے اور فوراً دوسرا مصرع ذہن میں آتے ہی اُن کو مصرع لگانے کی فکر میں ایسا محو کردے گا کہ وہ گاڑی گھوڑے سے کچلنے، کیچڑ میں پھنسنے، کسی سے ٹکرانے، نالی میں گرنے وغیرہ سے قطعاً بے فکر ہوکر کسی دوسرے عالم میں پہونچ جائیں گے۔ لیکن اب جو شاعر پیدا ہو رہے ہیں وہ وکالت بھی کرتے ہیں اور ڈپٹی کلکٹری بھی۔ پروفیسری بھی کرتے ہیں اور ایڈیٹری بھی طبابت بھی کرتے ہیں اور تجارت بھی ٹکٹ کلکٹری بھی کرتے ہیں اور کلرکی بھی اور اس کے بعد شاعر بھی ہیں جب شاعروں کے مشاغل وضع قطع شکل و صورت وغیرہ میں اس قدر انقلاب پیدا ہو چکا ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعری کے رنگ بدلنے پر لوگوں کو اس قدر تعجب کیوں ہے جب پٹوں کی جگہ انگریزی بال انگرکھے اور غرارے دار پاجامے کی جگہ سوٹ دہلی کے جوتے کی جگہ ڈاسن کے بوٹ وغیرہ نے لے لی ہے تو ہم کو اس پر کیوں حیرت ہوتی ہے کہ بلبل، نشیمن، صیاد، زلف کاکل، ناسور، کھرنڈ، برچھی، نیزہ، کٹاری، چھری

چاقو، انگیا، کرتی، دوپٹہ، کڑے، چھڑے، پازیب، جھانجھ، مہندی، سرمہ، مسی وغیرہ کی جگہ دوشیزگی، رعنائی، کفر، تبسم، جذبات، تخیلات، جذب، سکر، تموج، محویت، ملاحت، صباحت، فطرت، رنگ و بو، احساس، کیف، خمار، شباب، ترنم، موسیقی، نغمہ، وغیرہ نے لے لی ہے۔ جب کہنے والے وہ نہیں رہے تو کہا ہوا وہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

ہم مکمل شاعر ہوں یا نہ ہوں مگر خدا کا شکر ہے کہ اس دور میں پیدا ہوئے جب شاعر شکل و صورت میں عام انسانوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اگر اب سے کچھ دن پہلے پیدا ہوئے ہوتے تو ہمارا بھی وہی حال ہوتا جو ہم دوسروں کا بیان کر رہے ہیں۔ ہم تو اس تصور سے بھی لرزہ براندام ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم کچھ دن پہلے پیدا ہونا پڑتا اور ہم شاعر بھی ہوتے تو ہماری زندگی کیسی ہوتی اب تو یہ حال ہے کہ باوجود ہر حیثیت سے انسان ہونے کے جس وقت ہم پر شاعری کا دورہ پڑتا ہے ہم کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ غزل کہتے وقت ہمارا دل چاہتا ہے کہ

چلئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ؛ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار کے گھر میں غزل کی فکر ہو ؛ بچے کچے اور یہ بیوی میاں کوئی نہ ہو
ہم کہیں جس طرح جی چاہے نہ ہو کوئی مخل ؛ یعنی سب مر جائیں خالی ہو جہاں کوئی نہ ہو
اور غزل جب کہہ چکیں تو یہ خموشی ہو مگر ؛ داد دینے کے لیے پھر بے زباں کوئی نہ ہو

لیکن ہوتا ہے یہ کہ اگر گھر میں غزل کہنے بیٹھے اور اپنے اوپر پوری شاعرانہ کیفیت طاری کر لی ایک آدھ مصرع بھی کہہ لیا اور ٹھیک اس وقت جب کوئی لاجواب شعر ہونے ہی والا ہو کوئی نہ کوئی قصہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم شعر کہنے کی طرف سے قطعاً مایوس ہو جاتے ہیں کچھ نہیں تو کسی بچہ ہی نے پیسہ مانگنا شروع کر دیا جس کی پہلے تو ہم کو محویت میں خبر نہ ہوئی لیکن جب وہ مانگتے مانگتے تھک کر مچل گیا اور ضد کرنے لگا تو ہم کو لاحول ولا قوۃ کہہ کر اٹھنا ہی پڑا۔ اب وہ مصرع اور مصرع پر لگنے والا دوسرا مصرع سب غائب بلکہ آئندہ ہونے والے مصرعوں کی طرف سے بھی نا امیدی ہو جاتی ہے جی تو چاہتا ہے کہ صاحبزادے کو سر سے اونچا اٹھا کر دے ماریں لیکن بیکسی کی حالت میں بس دانت پیس کر رہ جاتے ہیں اور اگر کہیں ایک آدھ تھپڑ جھاڑ دیا تو اُن کی والدہ سے فوجداری ایسی ہوتی ہے کہ دن بھر غزل تو غزل ہم کو اپنا تخلص بھی یاد نہیں آتا۔ ہم نے بارہا یہ بات آزما کر دیکھی ہے کہ جب ہم غزل کہنے بیٹھتے ہیں ہمارے گھر والے ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ذرا یکسوئی سے بیٹھے ہیں لہٰذا اسی وقت اپنے پرائے محلے کے پڑوس کے بچوں کے، بزرگوں کے خاندان والوں کے دوستوں کے سب قصے شروع ہو جاتے ہیں کسی کی شادی کے لئے ہمارے مشورے کی ضرورت ہے تو اسی وقت اس کا موقع مناسب سمجھا جاتا ہے کسی بچے کی کوئی شکایت ہے تو اسی ہوتی ہے کسی کا کوئی کارنامہ ہے تو اسی وقت فخریہ بیان کیا جاتا ہے آٹے دال کے نرخ پر اسی وقت بحث ہوتی ہے۔ تنخواہ سستی اور غلہ جمع کر لینے کی اسکیم پر اسی وقت مباحثہ ہوتا ہے مختصر یہ کہ

سب کے نزدیک ہمارا ایسی قیمتی وقت بیکار وقت ہوتا ہے اور ہم ہیں کہ پہلے تو ہاں نہیں میں جواب دیتے رہتے ہیں پھر اُلجھنا شروع کرتے ہیں پھر گالیاں بکنے کو دل چاہتا ہے پھر سب کو مارنے کا ارادہ کرتے ہیں اور آخر میں گھر سے نکل کر کسی خاموش گوشہ میں بیٹھ کر بھولے ہوئے مصرعے یاد کرنا شروع کرتے ہیں۔ اب اگر اسوقت کسی کسی راہگیر نے اپنی بھیانک آواز میں "ارے ہاں رے نندیا" الاپنا شروع کردیا تو بس خودکشی کو دل چاہتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ہم نے کہا:۔

گلستان حیات چند روزہ کا نہ سن قصہ   بہار آئی تھی برسوں میں خزاں ......

کسی نے راستہ چلتے چلتے ہم سے پوچھ لیا "میاں کیا بجا ہوگا! آپ کے پاس گھڑی ہے؟" اور ہمارا دل چاہا کہ اس کی اور اپنی جان ایک کردیں ہم تو شعر کہہ رہے ہیں اور یہ گھڑی لئے پھر رہا ہے خدا معلوم کہاں سے اسوقت آمرا کیسا عمدہ شعر تھا کمبخت نے غارت کردیا لیکن جب اس کے جاتے ہی وہی شعر اس طرح ہوگیا کہ ؎

گلستان حیات چند روزہ کا نہ سُن قصہ   بہار آئی تھی برسوں میں خزاں آئی گھڑی بھر میں

تو ہم کو اس کا خیال بھی نہیں آیا کہ یہ "گھڑی" اسی راہگیر کی بتائی ہوئی ہے جس کو ہم اتنی گالیاں دے رہے تھے نہ وہ گھڑی کہتا نہ ہمارے ذہن میں گھڑی آتی نہ گھڑی کا یہ شعر مکمل ہوتا لیکن اس قسم کے واقعات بہت کم ہوتے ہیں زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی راہ چلتے ہوئے کی زبان سے "مقدمہ" سن کر پورا شعر اسی طرح کہہ جاتے ہیں کہ ؎

میرے دل کے منتشر اجزا کو یکجا کیجئے   آج پھر آباد دنیائے مقدمہ کیجئے

اور بعد میں خیال آتا ہے کہ استغفراللہ مقدمہ کی آواز سن کر "دنیائے تمنا" کو "دنیائے مقدمہ" لکھ گئے اور بس یہیں سے خیالات منتشر ہوجاتے ہیں۔

اب بتائیے کہ شعر کہنے کے لئے ہم یکسوئی کہاں سے لائیں۔ ہمارا اکثر دل چاہا کہ اس شاعری واعری کو چھوڑ کر اس عذاب سے نجات حاصل کرلیں لیکن یہ وہ بری بلا ہے کہ قبر سے پہلے چھوٹنے کا نام نہیں لیتی۔ توبہ کرلیتے ہیں تو بہ پر قائم رہتے ہیں لیکن جہاں دو چار آدمیوں نے آکر مشاعرے کی شرکت کے لئے مجبور کیا بس تو یہ ٹوٹ جاتی ہے اور وہی کیفیت شروع ہوجاتی ہے۔ جس سے ہم تو ہم ہمارے گھر والے بھی عاجز آگئے ہیں۔

مروّت

ہم نے تو نہایت شوق سے اپنے باغ میں نارنگی کے درخت لگائے اور ان کو ہمارے پڑوسی بھائی امجد کی بکری اس طرح چر گئی کہ گویا ہم نہ آجاتے تو جڑ بھی تناول فرما جاتی اب اس وقت ہمارا دل یہی چاہتا ہے کہ بھائی امجد کو مارتے مارتے گرا دیں اور ان کی بکری کے کباب بنا کر تمام محلہ میں تقسیم کریں یا اس کو اتنا پیٹیں کہ وہ خود نارنگی کا درخت بن جائے لیکن سوائے اس کے کہ دو ایک ڈنڈے لگا کر بکری کی ٹانگ توڑ دیں اور ہم سے کچھ نہیں ہوسکتا یا ہمارے دوست آمین ہمارے گرامو فون کو اپنی بیوی کے نام سے مانگ کر لے گئے اور وہاں اس میں اتنی کوک بھر دی کہ وہ ٹوٹ گیا۔ اب ہم اس کے سوا کیا کر سکتے ہیں کہ ان سے اس کی مرمت کے لئے کہیں حالانکہ ہم کو نیا گرامو فون لینا چاہئے لیکن نہیں لے سکتے۔

اسی طرح سراج نے ہماری گھڑی کا شیشہ توڑ دیا۔ لیکن ہم نے ان کا سر نہیں توڑا اس لئے کہ اُن سے مراسم تھے اور یہ ذرا چھوٹی سی بات تھی کہ ہم چار آنہ کے شیشے کے لئے اُن کا قیمتی سر توڑ دیتے لیکن اُنھوں نے فوراً دوسرا شیشہ لگوا دیا حالانکہ ان کو نئی گھڑی یا گھڑی کے دام دینا چاہئے تھے سلطان نے ہماری بائیسکل میں ایسا روگ پیدا کر دیا ہے کہ وہ ایک قسم کی موٹر سائیکل ہو کر رہ گئی ہے۔ یعنی اُس کے مڈگارڈ چلنے میں پھڑپھڑاتے ہیں لیکن ہم اُن سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ نئی بائیسکل دو۔ یا نئے مڈگارڈ بنوا دو اس لئے کہ وہ کہہ دیں گے کہ میں نے ڈھبری لگوا دی تھی۔ اور ہم کو خاموش ہو جانا پڑے گا۔ بھائی جمیل کے لڑکے نے ہمارے قلم کا نب توڑ دیا۔ لیکن ہمارے چہرہ پر ایک شکن بھی پیدا نہیں ہوئی ورنہ سب یہی کہتے کہ بچے کی غلطی پر افسوس کرتے ہیں بلکہ جب بھائی جمیل نے دوسرا نب لگایا اُس بھی ہم سے یہ کہتے نہ بن پڑا کہ جو نب ٹوٹ گیا ہے وہ ایک پیسہ والا ہے اور جو لگ رہا ہے وہ اس سے بہت کم قیمت ہے۔

ہماری اس قسم کی باتوں کو لوگ مروّت کہتے ہیں اور یہ واقعی مروّت ہی ہے جس سے ہم شدید سے شدید نقصان اُٹھانے کے باوجود خاموش ہو جاتے ہیں۔ یہ ہم خوب جانتے ہیں کہ نئی روشنی یعنی موجودہ دور میں مروّت "آوٹ آف فیشن" یعنی متروک ہو گئی ہے۔ لیکن جن لوگوں کی

فطرت میں مروت داخل ہو چکی ہے جیسے ہم۔ وہ لوگ غیر ارادی طور پر مروت کرتے ہیں اور نقصان اُٹھاتے ہیں حالانکہ اس وقت کامیاب انسان وہی ہے جس میں مروت کا نام نہ ہو اور انتہائی بدقسمت وہ ہے جس کی آنکھ میں مروت ہے۔ اب اگر ہم یہ چاہیں کہ اپنے کسی دوست کو ایک رقم قرض دیکر مع سود در سود واپس لے لیں تو یہ ہمارے لئے ناممکن ہو جائیگا ہم مروت سے مجبور ہو کر اصل رقم بہت خفیف منافع کے بعد لے کر خاموش ہو جائینگے۔ لیکن اگر کوئی ایسا شخص جس میں مروت نہ ہو اپنے باپ کو بھی کچھ قرض دے گا تو اصل رقم کی سہ گنی وصول کرے گا اور جب تک وصول نہ ہو جائیگی اتنے تقاضے کریگا کہ بیچارے قرضدار کو کسی اور سے قرض لے کر ان سے جان چھڑانا پڑے گی۔ بالکل یہی حال ہمارا اُن نادہندہ دوستوں کے ساتھ ہے جو قرض تو لے لیتے ہیں لیکن ادا کرنا بھول جاتے ہیں اس قسم کے لوگوں پر معمولی سا مقدمہ چلا کر بس ڈگری حاصل کر لیتے ہیں تاکہ ہماری رقم مع سود و خرچہ ہم کو مل جائے۔ لیکن اگر مروت نہ ہوتی تو ہم ان حضرت کو بغیر پھانسی دلوائے ہرگز نہ مانتے۔

عجیب زمانہ آگیا ہے کہ اگر کسی سے مُرَوَّت کے معنی پوچھے جائیں تو مشکل سے بتائیگا مروت کا عملی ثبوت دینا تو پھر بھی مشکل ہے بات اصل میں یہ ہے کہ

ہے بجائے خود زمانہ بیکسی میں مبتلا

اب مروت کا نشاں اپنے نہ بیگانے میں ہے

یہ تمام کچہریاں۔ عدالتیں۔ تھانے۔ کوتوالیاں۔ چوکیاں حوالاتیں جیلیں حبس دوام۔ عبور دریائے شور اور پھانسی سب دنیا کی بیمروتی کی زندہ مثالیں ہیں۔ اگر دنیا مروت سے بیگانہ نہ ہو جاتی تو ان میں سے کسی کی بھی ضرورت نہ پڑتی نہ کوئی مروت کے مارے کسی پر مقدمہ چلاتا نہ کوتوالی کی ضرورت پیش آتی نہ کوئی گرفتار ہوتا اور نہ تمام دنیا کی بڑی بڑی عالی شان عمارتیں جیلخانہ بن کر ہمارے اور آپ کے لئے بیکار ہو جاتیں لیکن تہذیب اور تمدن کے ارتقائی دور میں جہاں اور بہت سی وحشیانہ باتیں ترک کر دی گئی ہیں وہاں مروت بھی متروک ہو گئی ہے۔ آپ کہیں گے کہ جب مروت متروک نہیں ہوئی تھی اُس وقت بھی جیلخانے موجود تھے اور اس وقت بھی لوگ جیل حبس دوام عبور دریائے شور اور پھانسی کی حد تک آپس میں لڑتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس چیز کو مروت کہتے ہیں وہ آجتک دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوئی اور یہ لفظ بھی اس طرح پیدا ہو گیا ہے کہ دنیا والے اس کو دوروں کے متعلق استعمال کرتے ہیں اور اپنے متعلق کبھی غور ہی نہیں کرتے کہ ہم میں بھی مروت ہونا چاہیئے یا نہیں بس اس کا استعمال ایسے موقعوں پر ہوتا ہے کہ کسی شخص پر مجسٹریٹ نے پچاس روپیہ جرمانہ کر دیا اب وہ شخص جرمانہ ادا کرنے کے بعد تو اپنے دوستوں سے یہی شکایت کرے گا کہ دیکھئے جناب

یہ مجسٹریٹ صاحب ہمارے ہموطن بھی ہیں اور سسرالی عزیز بھی ہوتے ہیں اس کے علاوہ ہمارے پردادا کے ان نانا صاحب مرید تھے اور یہ ہمارے ایک زمانہ میں ہم جماعت بھی رہ چکے ہیں لیکن آج خدا نے ان کو حاکم بنایا ہے تو ہم کو پہچانتے بھی نہیں اور ذرا سے موٹر لڑنے پر پچاس روپیہ جرمانہ کر دیتے یہ حال ہے جناب آج کل مروّت کا" لیکن انہی حضرت کے متعلق ایک دوسرا آدمی یہ شکایتیں کرتا پھرتا ہے کہ "روز کا ساتھ اُٹھنا بیٹھنا لیکن ضرورت پر دس روپے مانگے تو اس بے مروّتی سے انکار کر دیا کہ حیرت ہو گئی جس میں مروت نہیں وہ انسان کس کام کا۔ اور اس دوسرے شخص کے متعلق ایک تیسرا شخص کہتا ہے کہ ذرا لڑکے کی آنکھ میں لگانے کے لیے افیون مانگی تو دم نکل گیا ہزار بہانے کرنا شروع کر دیے اتفاق سے ٹھیکہ پر نہیں ملی تھی ورنہ ہم خود ہاتھ نہ پھیلاتے لیکن ان کی بیمروّتی تو دیکھئے کہ چاول بھر افیون تک سے انکار کر دیا۔ خدا کی مار ہے ایسے کمبخت بے مروّتوں پر۔"

مروّت خواہ کتنی ہی اچھی چیز ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ تکلیف دہ بہت ہوتی ہے اور اگر کوئی بدقسمت انسان مروّت کو اپنی وضع بنا لے اور اس وضع پر قائم رہنے کا عزم کر لے تو سمجھ لیجئے کہ یہ دنیا والے اس کو یا تو بہت جلد مار ڈالیں گے یا وہ اپنے عزم میں ناکام ہو کر اس وضع کو چھوڑ بیٹھے گا۔ اب یہی دیکھئے کہ ہم نے جس وقت یہ طے کیا کہ ہم کسی رسالہ میں

بلامعاوضہ کوئی مضمون نہ دیں گے اس وقت ہم کو اپنے بامروت ہونے کا خیال بھی نہ آیا لیکن جب اپنے ارادے کو عملی صورت میں لانے کی کوشش کی تو ایک جھجک سی پیدا ہوئی کہ ہم کس طرح ان مدیران رسالہ جات کو اجرت کے لیے لکھیں جن سے دیرینہ تعلقات ہیں اور جو ہمارے تقریباً دوست ہو چکے ہیں لہٰذا رہ گئے ہم جھجک کر اور پھر بلا اُجرت مضامین بھیجنا شروع کر دیے تھوڑے دنوں کے بعد ہم نے طے کر لیا کہ اب مروّت کو بالائے طاق رکھ کر اجرت لینا شروع کر دیں ورنہ یہ رسالے مفت کے مضامین لکھواتے لکھواتے ہم کو مار ڈالیں گے اور ہماری مروّت دھری رہ جائے گی لہٰذا بہت غور و فکر کے بعد ارادے کر کے ان ارادوں کو ملتوی کر کے پھر ارادے کر کے اور ان ارادوں میں ناکام رہ کر ایک دن ہم نے ہمت کی اور ایک رسالہ کی مضمون کی فرمائش کے جواب میں اُجرت کے لئے لکھ ہی دیا۔ لیکن جب خط لیٹر بکس میں ڈال چکے تو افسوس ہوا کہ ہم نے خواہ مخواہ دس پندرہ روپے کے لئے ان تعلقات کو مجروح کر دیا جو اب تک قائم تھے بہرحال اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو ہی چکا۔ اب جو اُس خط کے جواب میں ایڈیٹر صاحب نے اپنی مالی مشکلات کا رونا رو دیا اور زبان کی خدمت کے لئے اپنے ایثار کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم کو اس پر مجبور کیا کہ "کچھ دن اور اسی بیگار کو برداشت کیجئے اس کے بعد انشاء اللہ آپ جو مانگیں گے ملے گا" تو جناب ہم کو بڑی شرم آئی اور ہم عرق عرق ہو گئے

اور ہم نے فوراً اُن کو لکھ دیا کہ نہیں صاحب غلطی سے پہلے خط میں آپکو لکھ دیا تھا میں تو آپ کا خادم ہوں آپ اطمینان رکھئے میں زندگی بھر مفت مضامین بھیجتا رہوں گا۔ تقریباً یہی حال ہر رسالہ کے ساتھ ہوا اور ہر رسالہ کی طرف سے جواب میں مضمون واحد لہذا ہمارے یہاں بھی بحمد اللہ خیریت ہوگئی اور باقی حالات بدستور۔

ایک زمانہ ایسا آگیا کہ ہم کو اس بیگار نے بیمار ڈال دیا اور مروت کی وجہ سے کسی سے انکار بھی نہیں کر سکتے تھے لہذا اپنی بیماری کو طول دیتے رہے بلکہ مرض کو خطرناک بناتے رہے یہاں تک کہ ہمارے لائق معالج نے فرمایا کہ تم کو دق ہوگئی ہے جاؤ پہاڑ پر یہ وہ وقت تھا کہ ہم نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لیا اور زندگی کے ساتھ ساتھ مجبوراً مضمون نگاری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے یہ بیماری منجانب اللہ ایک ایسی رحمت تھی جو ہم پر اب تک نازل ہوتی رہتی ہے اور جس کے پھل ہم کو اب تک مل رہے ہیں یعنی اس بیماری کے بعد ہمارا مزاج ایسا چڑچڑا ہوگیا کہ ہم نے غصہ میں آکر ایک سرکلر یعنی گشتی مراسلہ اس مضمون کا تمام رسائل کے نام بھیج دیا کہ اب چاہے جو کچھ ہو ہم مفت میں مضمون نہ دیں گے اور ایک سطر بھی بلا اُجرت نہ لکھیں گے۔" بلکہ اسی مراسلہ کے ساتھ ساتھ شرح اُجرت کا نقشہ بھی بھیج دیا۔ اس مراسلہ کے جواب میں بہت سے رسائل تو خاموش ہو رہے بہت سے رسائل نے پھر وہی مضمون

واحد والے خط بھیجے بہت سے رسائل نے کہا کہ "نہ آپ کی بات نہ ہماری بات یہ پیجئے گا" اور بہت سے ایسے رسائل بھی جنھوں نے کہہ دیا کہ "مضمون وی پی بھیج دیجئے۔" ہم نے مضمون وی پی کر دیا اور جناب جس وقت اس کے روپے وصول ہوئے ہم کو پہلی مرتبہ اپنی اس حماقت کا احساس ہوا جس کو اصطلاح عام میں مروت کہتے ہیں اور ہم نے طے کر لیا کہ اب اس کمبخت مروت کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہ دیں گے۔ چنانچہ ہم نے یہ سلسلہ جاری رکھا اور معاوضہ لینے کی سختی سے پابندی کی متعدد بار ہمارے پیروں کو لغزش ہوئی ہمارے پیروں کو لغزش ہوئی ہمارے ارادوں میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہوئے ہم نے مفت بھیجنے کے ارادے سے مضمون لکھ ڈالا لیکن پھر ہم کو ہوش آگیا اور ہم نے وی پی کا فارم بھی بھر دیا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ ہم میں مروت ہے ہی نہیں تو غلط ہوگا اتنا ہم ماننے کو تیار ہیں مروت کے معیار میں ضرور تبدیلی ہوگئی ہے مثلاً یہ کہ پہلے اُجرت لینا ہی گناہ سمجھتے تھے اب اُجرت کی کمی اور بیشی میں مروت اپنے جلوے دکھاتی ہے۔

مروت حقیقتاً ایک ایسی کمزوری ہے کہ اگر خدانخواستہ اس کا علم کسی کو ہوگیا تو بس سمجھ لیجئے کہ آئی کمبختی۔ اب اس مروت کی کمزوری سے ایسا فائدہ اٹھایا جائے گا کہ مزاج بھی درست ہو جائے کوئی تو پوچھتا ہے کہ "بھائی صاحب بڑا لاجواب کپڑا شیروانی کا لائے کہاں سے خریدا ہے بھائی ہم کو بھی منگا دو"

اب وہ بدنصیب جو بامروت ہے فوراً اپنی شیروانی ان حضرت کے نذر کردیگا گویا کہتا ہے کہ "ارے یار اگر تم اشارہ بھی کردو تو گاؤں سے نہایت نفیس گھی آجایا کرے ڈالڈا کوکوجم اور بناسپتی گھی کھاتے کھاتے ناک میں دم آگیا ہے۔" اب آپ گویا زندگی بھر گھی پہونچوانے کے نوکر ہوگئے اور اگر آپ کی مروّت نے زیادہ جوش کیا تو قیمت بھی آپ ہی ادا کریں گے ایک صاحب تشریف لاتے ہیں کہ "آپ کے والد اور میرے چچا ہم جماعت تھے اس کے علاوہ خود میں بھی آپ کا خادم ہوں اب یہ کتنی بڑی بات ہے کہ بندہ زادہ آپ ہی کے دفتر میں ملازمت کا امیدوار ہے اگر آپ باقی تمام درخواستیں کس طرح غائب کرادیں تو اسی کا انتخاب ہوسکتا ہے اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ کے اختیار میں ہے میں تو سمجھوں گا کہ آپ نے مجھکو خرید لیا۔" اول تو آپ بامروّت ہیں دوسرے وہ شخص لسّان ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کسی نہ کسی طرح تمام درخواستیں اُڑادیں گے اور جب اُن کے غائب ہونے کا پتہ چل جائے گا تو آپ ملازمت سے علحدہ کردیے جائیں گے مختصر یہ کہ اگر آپ کی مروّت کا پتہ دنیا کو چل گیا ہو تو بس سمجھ لیجیے کہ آپ کی گردن میں چکی کا پاٹ ڈال کر یہ دنیا والے آپکو عمیق ترین سمندر میں غرق کرکے چھوڑیں گے "جل تو جلال تو صاحب کمال تو اس مروّت کی بلا کو ٹال تو۔"

جس طرح آجکل دق کی مختلف قسمیں یکدم سے نکل آئی ہیں کہ پھیپھڑے کی دق، آنتوں کی دق، ہڈی کی دق، آنکھوں کی دق، کان کی دق، ناک کی دق، ناخن کی دق، بالکل اسی طرح مروّت کی بھی اصلیا قسمیں ہیں جن میں سب سے زیادہ مہلک مروّت تو وہ ہوتی ہے جو دل کی ہو کہ حاضر غائب ہر طرح اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی وقت دوست کا خط آگیا کہ دوسہری، لنگڑا، سفیدہ، فجری، کجوری، وغیرہ آموں کے دو تین جھابے پارسل کردیجیے اب آپ پر گویا اس کی تعمیل اس طرح فرض ہوجائے گی کہ بیوی کا زیور بیچ کر کہیں سے قرض لیکر کسی کے یہاں چوری کرکے غرضکہ جس طرح بھی ممکن ہوگا وہ پارسل ضرور روانہ ہوں گے

ایک قسم کی مروّت کا علاج قبر میں ہوا کرتا ہے۔ ایک دوسری قسم مروّت کی وہ ہے جس کو منہ دیکھے کی یا آنکھ کی مروّت کہتے ہیں اس کا قاعدہ یہ ہے کہ دوست ایک نہیں دس ہزار خط بھیجیں لیکن اُدھر سے جواب غائب اور اگر کہیں وہ دوست صاحب خود پھٹ پڑے تو تمام خاموشیوں کی تلافی ہوجاتی ہے اور انکار کرتے نہیں بن پڑتا جو کچھ وہ فرماتے ہیں اسکی تعمیل ہوتی ہے اور وہ مروّت کی کمزوری سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جہاں وہ نظروں سے غائب ہوئے بس مروّت بھی تشریف لے گئی اس قسم کی مروّت کا علاج تو بہت آسان ہے لیکن آنکھ ایسی نعمت سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

سب سے زیادہ اچھا تو یہ ہے کہ مروّت کی جڑیں اکھاڑ کر پھینکدی جائیں

اور یاد رکھئے کہ جب تک مروت کا نشان بھی باقی ہو ترقی کرنیکا کوئی تصور اپنے ذہن میں نہ لائیے اس وقت کامیاب وہی انسان ہے جو بامروت نہیں۔ دور کیوں جائیے انگریزوں کو دیکھ لیجئے کہ ان کے یہاں کی کتاب لغات میں اس مفہوم کا کوئی لفظ ہی نہیں ہے اور یہی وجہ ہو کہ آج کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ وہ تاجر ہیں اور مروت تجارت کی سخت ترین دشمن لہٰذا ان کے یہاں اسکی کاشت ہی نہیں ہوتی اور ہم ہندوستانیوں کے یہاں انسان بنتا ہے بجائے چار کے پانچ عناصر سے جس میں ایک مروت بھی ہے تو جناب ایسی صورت میں کیا امید کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان ترقی کریگا۔ آج اگر ہم مروت سے بیگانہ ہو جائیں تو ترقی اور کامیابی ہمارے قدم چومے گی لیکن یہ بھی ایک قسم کی مروت ہے کہ ہم مروت سے بیگانہ ہونا نہیں چاہتے۔

مطب

مطب کیا ہے اس کو کم و بیش سب جانتے ہوں گے اور جو نہیں جانتے وہ صرف اتنا سمجھ لیں کہ جہاں انگریزی یا اردو کے اخبارات سے پھٹے ہوئے بہت سے قارورے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں وہ جگہ عام طور پر مطب ہوتی ہے مطب کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہاں بہت سے مرد بھی عورتوں کی طرح ڈولی پر جاتے ہیں اور ڈولی پر بیٹھنے کے بجائے لیٹے ہوئے ہوتے ہیں جو لوگ خدا کے فضل سے چار پیسے والے ہیں وہ دلہنوں کی طرح پالکی پر تشریف لیجاتے ہیں اور جو ان سے بھی زیادہ روپے والے ہیں وہ مطب جاتے ہی نہیں بلکہ مطب کو اپنے دولت خانہ پر بلا لیتے ہیں مختصر یہ کہ مطب کی یہ دو موٹی موٹی نشانیاں ہیں اور ان دونوں سے زیادہ اہم شناخت ایک تیسری بھی ہے جو پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ہے یعنی مطب پر ایک سائن بورڈ بھی لگا ہوتا ہے

جس سے علاوہ یہ معلوم ہونے کے کہ یہ مطب ہے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا مطب ہے کس وقت سے کس وقت تک مطب رہتا ہے اور کب دولت خانہ پہنچتا ہو۔

مطب کے متعدد اقسام بھی ہیں یعنی حکیم کا مطب ڈاکٹر کا مطب بید کا مطب جراح کا مطب وغیرہ ان اقسام میں امتیاز ذرا دشوار کام ہے لیکن پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی کے لئے یہ بھی کچھ مشکل نہیں مثلاً اگر وہ مطب کسی حکیم کا ہوگا تو اس میں ایک بات یہ ضرور رہے گی کہ سائن بورڈ اردو میں لکھا ہوگا۔ اس کو دری چاندنی مسند اور تکیے سے آراستہ کیا گیا ہوگا اور اس میں مسند تکیہ لگائے جو شخص بیٹھا ہوگا وہ ہندوستانی لباس میں ہوگا اس کے سامنے خاصدان اور اگالدان ضرور رہے گا جہاں سب باتیں یکجا ہوں وہاں تو بلا پس و پیش یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ مطب کسی حکیم کا ہے بالکل اسی طرح اگر مطب ڈاکٹر کا ہے تو اس کا سائن بورڈ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہوگا اور اس میں بجائے فرش کے ایک میز اور اس کے سامنے دیوار سے لگی ہوئی چاروں طرف کرسیاں ہوں گی میز پر قلم لئے جو شخص بیٹھا ہوگا وہ انگریزی لباس میں ہوگا اور ننگے سر اس کی میز پر قلم دوات کاغذ کے علاوہ ایک اور چیز ربڑ کی نلکیوں کی بنی ہوئی رکھی ہوگی جس میں کچھ حصہ دھات کا بھی ہوگا اور جس کو وہ بار بار اٹھا کر کان میں لگاتا ہوگا یہ تمام علامتیں ڈاکٹری مطب کی ہیں لیکن اس میں بھی تھوڑے سے مغالطہ کی گنجائش ہے یعنی بہت سے حکیم ایسے ہیں جنھوں نے

اپنے مطب میں بجائے فرش کے کرسیاں رکھی ہیں اور بہت سے ڈاکٹر ایسے ہیں جو بجائے انگریزی لباس کے ہندوستانی لباس پہنتے ہیں ان صورتوں میں عقلمند سے عقلمند آدمی دھوکا کھا سکتا ہے لیکن اگر ذرا محققانہ رفتار ذہنی کا آدمی ہے تو وہ دوسری علامتوں کا موازنہ کرکے ہمیشہ صحیح نتیجہ پر پہونچے گا۔

مثلاً اگر کسی طرح سمجھ میں نہ آتا ہو کہ یہ مطب حکیم کا ہے یا ڈاکٹر کا تو ذرا سی عقلمندی یہ کرنا چاہئے کہ فوراً نبض دکھا دے اُس کے بعد جب وہ نسخہ لکھے گا تو یہ راز بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ حضرت خود کیا ہیں یعنی ڈاکٹر ہیں یا حکیم بس جو کچھ وہ خود ہوں اُسی کا مطب ہوگا یہ دراصل بڑے گر کی بات ہے مگر ہم بتائے دیتے ہیں کہ اگر نسخہ لکھنے والے نے انگریزی میں نسخہ لکھا ہے تو وہ یقیناً ڈاکٹر ہوگا اور اگر اُردو کے حروف اور فارسی زبان میں لکھا ہے تو اُن کے حکیم ہونے میں شک نہیں جو لوگ پڑھے لکھے نہیں ہیں اور انگریزی اور اُردو میں امتیاز نہیں کر سکتے وہ صرف اتنا یاد رکھیں کہ اگر نسخہ لکھتے وقت قلم داہنی طرف سے بائیں طرف چلا ہے تو ڈاکٹر ہے۔ یہ پہچان اتنی بڑی ہے کہ اب سائن بورڈ فرش لباس فرنیچر وغیرہ سے شناخت کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

مطب کے اقسام میں فرق محسوس کر لینا اتنا دشوار نہیں جتنا حکیم اور ڈاکٹر کے مختلف اقسام کو سمجھنا مشکل ہے اس لئے کہ ایک ڈاکٹر کی ہزارہا قسمیں ہوتی ہیں آدمی کے ڈاکٹر، جانوروں کے ڈاکٹر، علم کے ڈاکٹر، قانون کے ڈاکٹر وغیرہ وغیرہ

اگر بفرضِ محال یہ شناخت ہو بھی گئی کہ جس کے پاس ہم آئے ہیں وہ جانور، علم یا قانون وغیرہ کا ڈاکٹر نہیں بلکہ آدمیوں کا ڈاکٹر ہے تو بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ڈاکٹروں کے اقسام ختم ہو گئے اس لئے کہ ان ڈاکٹروں کی بھی صدہا قسمیں ہیں ایک ڈاکٹر وہ ہیں جنھوں نے میڈیکل کالج میں پانچ سال کے کورس کو دو ایک مرتبہ فیل ہو کر سات آٹھ برس میں پڑھا اور پاس ہو کر ڈاکٹر بنے ایک وہ ہیں جنھوں نے گھر بیٹھے ایک آدھ کتاب پڑھی اور بذریعہ ڈاک امتحان دے کر ڈپلوما منگا لیا اور ڈاکٹر بن گئے ایک وہ ہیں جنھوں نے بغیر کچھ پڑھے امریکہ تک سے ایک منی آرڈر بھیج کر ڈگریاں منگا لیں یا ڈگریاں خود بذریعہ دیلوا گئیں اور ان کو وصول کر کے ڈاکٹر ہو گئے۔ غرضکہ ڈاکٹر بننے کے مختلف طریقے ہیں اور ڈاکٹر بھی مختلف اقسام کے ہوتے ہیں جس کو لوگ سول سرجن کہتے ہیں وہ بھی ڈاکٹر، اسسٹنٹ سرجن ہے وہ بھی ڈاکٹر بلکہ بعض اوقات جو کمپاؤنڈر ہیں وہ بھی ڈاکٹر سمجھا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی بیچارے نے لاہور میں پانچ سال سر کھپایا ہے تو کسی نے لکھنؤ میں اور جن کو سول سرجن بننے کا شوق ہوا وہ سات سمندر پار ولایت جا پہنچا اور جن لوگوں کے نزدیک ڈاکٹر و ڈاکٹر سب برابر والاسہل پسندیدہ ہے وہ آگرہ سے سب اسسٹنٹ سرجن بن کر ڈاکٹر کہلانے لگے مگر سب سے زیادہ مزے میں وہ ڈاکٹر صاحبان ہیں جن کو گھر بیٹھے ایک دواؤں کے بکس اور ایک کتاب "راہبر ہومیوپیتھی" نے ڈاکٹر بنا دیا ہے۔

بالکل یہی حال حکیموں کا ہے کہ کسی نے طبیہ کالج دہلی میں حکیم اجمل خاں مرحوم کے تجربوں سے کچھ حاصل کیا ہے تو کسی نے تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں حکیم صاحبان جھوائی ٹولہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے کچھ سیکھا ہے۔ اور بہت سے وہ حکیم بھی ہیں جنھوں نے اپنے دولت خانہ سے ایک خط بھیج کر "عمدۃ العلماء" کی سند پنجاب سے منگا لی ہے۔ بہر حال ہیں سب حکیم اور حکیم بن جانے کو گھر کی کھیتی سمجھتے ہیں اس لئے کہ طبیہ کالجوں کی کچھ ایسی ہوا چلی ہے کہ علی گڈھ کالج سے لے کر ہر حکیم کا مطب ایک طبیہ کالج بن گیا ہے اور ہر جگہ سے حکیم بن جانے کی سند بہت آسانی کے ساتھ مل سکتی ہے حالانکہ ان حکیموں کے نسخے اپنی تاثیر کے اعتبار سے عدم آباد کے پاسپورٹ سے کم ثابت نہیں ہوتے لیکن قبرستانوں کا آباد ہونا ان کو "غیر حکیم" ثابت نہیں کر سکتا اور ان کے مطب کا سائن بورڈ یا سائن بورڈ پر سے لفظ "حکیم" کسی طرح علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

غرضکہ ان مختلف اقسام کے ڈاکٹر اور حکیموں کی کثرت نے ہر شہر بلکہ شہر کے ہر گلی کوچہ پر ایسا قبضہ کر لیا ہے کہ کوئی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی سڑک ایسی نہیں مل سکتی جس پر ایک دو حکیم یا ڈاکٹر کے مطب کا سائن بورڈ نہ ہو ہر شہر میں دو ہی قسم کے سائن بورڈ نظر آتے ہیں ایک وہ جن پر بی اے ایل ایل بی، وکیل ہائیکورٹ یا ایڈوکیٹ لکھا ہوتا ہے دوسرے وہ جن پر مطب لکھا ہو۔ مطب حکیم کا ہو یا ڈاکٹر کا عام طور پر صبح کے وقت گرم ہوتا ہے اور

شام کے وقت بھی کچھ آثار مطب ہونے کے پائے جاتے ہیں لیکن دوپہر کو اس کے دروازے عام طور پر بند رہتے ہیں مطب کے ان دونوں اوقات میں بھی موسم کے اعتبار سے تغیر ہوتا رہتا ہے مثلاً اگر گرمیوں میں مطب کا وقت صبح سات بجے سے نو بجے تک ہے تو جاڑے میں آٹھ بجے سے دس بجے تک ہو جائے گا۔ مطب کا عام منظر میدان حشر کی طرح کا ہوتا ہے ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے لوگ اپنی اپنی بولیاں بولا کرتے ہیں اور حکیم یا ڈاکٹر گردن جھکائے نسخہ لکھا کرتے ہیں اگر کوئی شخص اپنے علاج کے لئے نہیں بلکہ مطب کی سیر کرنے کو مطب میں چلا جائے تو اس کو عجیب کیفیت نظر آئے گی کچھ لوگ بچوں کو کندھے سے لگائے ان کو بہلاتے اور چمکارتے ہوئے نظر آئیں گے کچھ لوگ بچوں کو کھانستے اور ہانپتے دکھائی دیں گے۔ کچھ لوگ ڈولی میں پڑے ہوئے کراہتے ہوں گے، کچھ لوگ قارورے کو اخبار سے بار بار لپیٹ رہے ہونگے کچھ پردے دار ڈولیوں کے پاس انچارج بنے کھڑے ہوں گے اور اس جدوجہد میں مصروف ہوں گے کہ ایکدم حکیم صاحب کے سامنے پیش ہو جائیں کسی طرف سے آواز آتی ہوگی۔

"حکیم صاحب رات سے جاڑا لگ کر بخار آیا" کوئی کہتا ہوگا۔

"حکیم جی کھانسی دم نہیں لینے دیتی" اور جب سب ایک دم سے بولتے ہوں گے تو مختلف آوازیں آتی ہونگی "کہ رات سے بخار ہے" "کمر

میں درد ہے" "متلی نہیں جاتی" قبض ہو گیا ہے۔ سر گھومتا ہے' پیروں پر ورم ہے' بھوک نہیں لگتی۔ "حکیم جی' اے حکیم صاحب' حکیم جی' اے حکیم جی بابو جی' بابو صاحب وغیرہ وغیرہ۔"

اس تمام شور و غل میں حکیم صاحب نہایت اطمینان کے ساتھ ایک ایک مریض کو بلاتے جاتے ہیں اور چاہے ٹانگ میں درد ہو یا حال سنانے والے کی بیوی بیمار ہو مگر حکیم صاحب نبض دیکھنے کے لئے ہاتھ ضرور بڑھاتے جاتے ہیں نسخہ دیکھتے ہیں اور سوال شروع کرتے ہیں۔ کیا غذا ہوئی؟ نیند آئی؟ افاقہ ہے؟ لیپ لگایا تھا؟ غرارہ کیا تھا؟ اجابت ہوتی ہے قبض کے ساتھ ورم میں کمی ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب پانے کے بعد اب اگر مریض آیا ہے تو پیٹ ضرور دیکھتے ہیں اور دریافت کرتے جاتے ہیں۔ "یہاں درد ہے؟ یہاں؟ اچھا یہاں؟" اور پھر دریافت فرماتے ہیں۔ "قارورہ لائے؟" ان تمام باتوں کے بعد آپ پھر نسخہ دیکھتے ہیں اور اپنے شاگردوں کی طرف نظر اٹھا کر فرماتے ہیں: لکھو نسخہ بموجب بیدالورد اول بجوزند و عقب آن گل بنفشہ کشمیری' برگ گاؤزبان' پوست بیخ کاسنی' تخم خطمی' تخم خبازی' عناب ولایتی' سپستان' گلوئے تازہ' خاکسی' شاہترہ' "در آب جوشانیدہ صاف نمودہ شربت بنفشہ -؛ اکردہ بنوشند" اٹھاؤ' ٹھہراؤ' ڈولی ہلاؤ' قارورہ' اس کے بعد مریض کی طرف رخ ہوتا ہے اور فرماتے ہیں کھٹی چیز نہ کھائے گا

ئی چیز نہ کھایے گا۔ کل فاقہ" اور فاقہ کہتے ہی کہتے" دوسرے مریض کی آواز بلند ہوتی ہے اور دوسرے مریض کے ساتھ بھی بالکل یہی کیا جاتا ہے جو اس مریض کے ساتھ کیا گیا صرف دواؤں میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے تعجب تو یہ ہے کہ حکیم صاحب کے شاگرد یعنی نسخہ لکھنے والے نسخہ میں "اٹھا، دھرا، ڈولی ہلاؤ، قارورہ" کیوں نہیں لکھ جاتے اس لئے کہ یہ فقرہ بالکل نسخہ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ حکیم صاحب جیسے ہی دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں پہلا مریض تھوڑی دور جاکر پھر لوٹ آتا ہے اور پوچھتا ہے:

"حکیم صاحب ارہر کی کھچڑی کھا سکتا ہوں؟"

حکیم صاحب: "نہیں صرف مونگ کی دال کا پانی اور روٹی کا چھلکا۔"

مریض: "حکیم صاحب منہ کا مزا خراب ہے ذرا سا آم کا اچار کھا لوں؟"

حکیم صاحب: "جی نہیں آپ کے لئے زہر ہے۔ آپ صرف مونگ کی دال کا پانی اور روٹی کا چھلکا۔ آپ کے جگر کا فعل خراب ہے۔ تلی بڑھی ہوئی ہے پیٹ سخت ہے۔"

حکیم صاحب دوسرے مریض کا حال سننے لگتے ہیں پہلا مریض پلٹتا ہے اور پوچھتا ہے۔

"حکیم صاحب چا پی سکتا ہوں؟"

حکیم صاحب: "ہلکا رنگ دودھ زیادہ شکر کم صرف ایک پیالی دوا کے گھنٹہ بھر کے بعد۔"

مریض: "اور بسکٹ؟"

حکیم صاحب: "ابھی نہیں ذرا ورم جگر کم ہو تو بتاؤ۔"

مریض: "تو وہ کب کم ہوگا سال بھر تو ہو گیا۔"

حکیم صاحب غصہ سے پیچ و تاب کھا کر غصہ کو ٹال کر دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور پہلا مریض جواب کا انتظار کر کے آخر چلا جاتا ہے حکیم صاحب دوسرے مریض کو دیکھتے ہی فرماتے ہیں: "معلوم ہوتا ہے آپ کے یہاں عرق باقاعدہ تیار نہیں ہوتا آنچ زیادہ لگ گئی یا اجزا بے ترتیب ہو گئے۔ اچھا میں اپنا کشید کیا ہوا عرق دیتا ہوں بیس روپیہ کی دو بوتلیں ہیں اس وقت آپ کی نبض سے معلوم ہو رہا ہے کہ راستہ کی تھکان کا آپ پر بہت اثر ہے ابھی چلئے پھرئیے نہیں میں خود حاضر ہو جایا کروں گا کل صبح مطب سے اٹھ کر پہلے آپ کو دیکھوں گا قارورہ رکھ چھوڑیے گا اور میرے آنے تک ناشتہ نہ کیجیے گا۔"

مریض فوراً پانچ روپیہ کا نوٹ نذر کرتا ہے اور حکیم صاحب "اس کی کیا ضرورت ہے" کہتے ہوئے نوٹ جیب میں رکھ لیتے ہیں گویا پانچ یہ اور پندرہ وہ جن کا وعدہ لے لیا ہے اور بیس دوا والے یعنی ایک ہی مریض سے

چالیس روپے نقد کر لئے۔ اس کا نام طبابت ہے جو دیکھنے سے نہیں آتی فطرتاً حکیموں میں ہوتی ہو اور جس میں یہ بات نہیں اس کا حکیم ہونا یا نہ ہونا تقریباً یکساں ہے۔ ایک باقاعدہ حکیم ایسے ایسے چالیس روپے معلوم نہیں دن بھر میں کتنے مریضوں سے اینٹھ لیتا ہے اور اگر کوئی ایسا بھیک منگا مریض ہے تو اس سے کم از کم گرمیوں کے زمانہ میں ایک درجن کورے گھڑے بشرطیکہ وہ کمہار ہو یا سیر بھر چمبیلی کا تیل بشرطیکہ مریض تاجر عطر ہو، یا ایک بوری آٹا بشرطیکہ مریض غلہ فروش ہو مل ہی جائیگا۔ غرضکہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی۔ نہ چھوڑی جائے گی اور واقعی اگر بچارے طبیب یہ نہ کریں تو پیٹ کیسے بھریں آخر اُن کا ذریعۂ معاش یہی طبابت ہی تو ہے اسی سے روپیہ نہ کمائیں تو کیا بیوی بچوں کو زہر دیدیں؟

حکیم صاحبان کی سواری کی پہلے تو نیس تھی مگر اب جہاں طب میں بجائے فرش کے کرسیاں رکھی گئی ہیں وہاں سواری میں بجائے فٹن، لینڈو بلکہ موٹر ہو گیا ہے۔ موٹر کیا اگر حکیم صاحبان ہوائی جہاز بھی رکھ لیں تو اُن کی گرہ سے کچھ خرچ نہیں ہوتا اس لئے کہ ان کی سواری کے ذمہ دار بھی مریض ہیں حکیم صاحب کو گھر پر بلانے کے معنی یہ ہوئے کہ آٹھ دس پندرہ روپے جو کچھ ان کی فیس ہو وہ الگ اور ایک روپیہ سواری کا علٰحدہ ضرور دینا پڑتا ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ دیدیجئے "حکیم صاحب" اس کی کیا ضرورت

ہے "مگر انشاء اللہ ضرور قبول کر لیں گے اور اتنا سب کچھ لینے کے بعد بھی حکیم صاحب کے سر مریض کے زندہ رہنے یا مرنے کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی حکیم صاحب کی بلا سے مریض اچھا ہو یا جہنم میں جائے وہ اپنی فیس اور موٹر یا گاڑی کے کرایہ سے جیب گرم کر لیتے ہیں اُس کے بعد اگر مریض کو نسخہ سے نقصان پہونچا اُس کی حالت بد سے بدتر ہو گئی تو حکیم صاحب بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے ہمیشہ مریض پر خفا ہوں گے کہ یقیناً کوئی بدپرہیزی ہوئی ہے۔ برف کا پانی پی لیا ہوگا، کباب کھا لئے ہوں گے ہوا میں بیٹھے ہوں گے قبل از وقت کھانا کھایا ہوگا، دوا نہ پی ہوگی، بارش میں بھیگے ہوں گے، چہل قدمی زیادہ کی ہوگی "غرضکہ حکیم صاحب اتنے کثیر التعداد الزام لگائیں گے کہ ایک آدھ واقعی صحیح بھی نکل آئے گا اور جب مریض اس کا اقرار کرے گا تو حکیم صاحب ناک چڑھا کر گردن ہلا کر نہایت فخریہ انداز سے فرمائیں گے " وہ تو میں پہلے جانتا تھا کہ بدپرہیزی ضرور ہوئی ہے ورنہ مجال نہ تھی کہ میری دوا سے فائدہ نہ ہوتا اتنا لاجواب نسخہ تجویز کیا کہ اگر احتیاط سے استعمال ہوتا تو مرض کب کا دور ہو جاتا مگر اس کا کیا کیا علاج اگر کوئی زہر کھالے آپ خود غور کیجئے کہ ملائی کی برف آپ کے لئے کس حد تک نقصان دہ ہے۔ لاحول ولا قوۃ "استغفر اللہ توبہ توبہ" حکیم صاحب نے فخریہ کہہ کر تمام ذمہ داری مریض کے سر رکھدی

اور خود الگ ہو گئے اور ایسے الگ ہوئے گویا فیس ہی نہیں لی ہے یہاں مریض کو نمونیہ ہوا، ڈبل نمونیہ ہوا، سانس اُکھڑی، نبضوں کا نظام خراب ہوا اور بیچارہ براہ مطب قبرستان جا بسا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحبان کا ذریعۂ معاش بھی دراصل ڈاکٹری ہے۔ لیکن وہ آدمی کو پہچاننے اور اُس پر قابو حاصل کرنے میں حکیم صاحبان سے زیادہ ماہر ہوتے ہیں یا یہ سمجھئے کہ حکیم بیچارے تو صرف مطب اور ایک آدھ مریض کو گھر جا کر دیکھنے کے سہارے پر جیتے ہیں مگر ڈاکٹر علاوہ مطب اور پرائیوٹ پریکٹس کے ملازم سرکاری بھی ہوتے ہیں اگر ان کو مطب سے اور پرائیوٹ پریکٹس سے کچھ بھی آمدنی نہ ہو تو تنخواہ اتنی ہوتی ہے کہ مزے سے کھا پی لیں، لیکن حکیم بیچارے تو نوکر نہ چاکر اگر مریضوں سے آمدنی بند ہو جائے تو کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ حکیم زیادہ خوش اخلاق مشہور ہیں اور ڈاکٹر آمدنی کی طرف سے مطمئن ہونے کی صورت میں پرائیوٹ پریکٹس کے لئے جان نہیں دیتے لہٰذا اُن کا اخلاق اتنا عام پسند نہیں سمجھا جاتا پھر بھی ڈاکٹری علاج کے لئے لوگ ایسے قائل ہو گئے ہیں کہ بیمار پڑتے ہی پہلے ڈاکٹر صاحب کے پاس جاتے ہیں اور اگر ڈاکٹری علاج سے مایوس ہو گئے تو پھر حکیم صاحب کے پاس جاتے ہیں بہرحال سب سے پہلے ڈاکٹری علاج کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسپتالوں کو چھوڑ کر صبح کے

وقت ہر ڈاکٹر کے مطب میں دو ایک موٹر چار پانچ گاڑیاں کچھ تانگے کچھ یکے اور حکیم صاحب کے مطب کی طرح ڈولیاں اور فینس تک موجود ہوتی ہیں بچے بوڑھے، مرد، عورت، ہندو مسلمان امیر غریب، سب ہی قسم کے مریض کرسیوں پر بیٹھے رہتے ہیں کچھ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے کھڑے رہتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب ہر مریض کا حال سُن سن کر نسخہ لکھتے جاتے ہیں اور ہدایتیں دیتے جاتے ہیں کہ ہر دو گھنٹہ کے بعد ایک خوراک دوا سوتے وقت ٹھنڈے پانی سے یہ پڑیا کھائی جائے گی، اور کھانے کے بعد دو گولیاں گرم پانی یا چاء سے پی جائیں گی، غذا میں صرف دودھ یا آش جو کسی مریض کے کپڑے اُتروا کر کانوں میں لگانے والے آلے سے جو بیک وقت ڈاکٹر اور مریض دونوں کے لگتا ہے، صرف کان اور سینہ کا فرق ہوتا ہے، سینہ دیکھتے ہیں اور مریض سے کہتے ہیں: "بولو ایک دو تین' ہاں پھر بولو ایک دو تین ہاں پھر کہو ایک دو تین" اس کے بعد آلہ رکھ کر مریض کے سینہ پر بایاں ہاتھ رکھ دیتے ہیں اور داہنے ہاتھ کی بیچ والی اُنگلی سے بائیں ہاتھ کی بیچ والی اُنگلی کو ٹھونکتے ہیں اور مریض سے کہتے ہیں: "بولو۔ ایک، دو تین پھر بولو: ایک دو تین" اس معائنہ کے بعد نسخہ لکھتے ہیں اور مریض سے نہایت سنجیدہ چہرہ بنا کر فرماتے ہیں کہ "آپ ذرا مستقل مزاجی سے علاج کیجئے اور غذا کا خاص اہتمام رکھئے۔ آپ کے دراصل ضرورت ہے

پہاڑ پر جانے کی۔ اچھا کل آپ سفید پیالے میں بلغم دیں گے اُس کے بعد میں کسی نتیجہ پر پہونچ سکوں گا گویا سینہ کا ٹھونکنا بجانا محض تفریحاً تھا۔ اور جو نسخہ آج تجویز فرمایا ہے وہ رسم مطب کے مطابق قبل تشخیص ہے بہرحال مریض بیچارے کے ذہن میں یہ خیالات ذرا کم آتے ہیں ورنہ علاج ہی نہ کرائے اسی طرح دوسرا مریض آجاتا ہے اس کی زبان نکلوائی جاتی ہے آنکھوں کے پپوٹے اُلٹ کر دیکھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹری کا رعب جمانے کے لئے کان میں لگانے [illegible] بھی بلا ضرورت استعمال کیا جاتا اور ایک دو سطر کا نسخہ لکھ دیا جاتا ہے جس کے متعلق ہدایت ہوتی ہے کہ فلاں دوکان سے خرید یئے گا اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کو وہاں سے کمیشن ملتا ہے اور اگر کہیں مریض نے ڈاکٹر صاحب کی بتائی ہوئی دوکان کے علاوہ نسخہ خرید لیا اور نسخہ پر ڈاکٹر صاحب نے دوسرے دواخانے کی مہر دیکھی تو ڈاکٹر صاحب دوا کی اچھائی یا برائی یعنی دوا کے فائدہ کرنے یا نہ کرنے نقصان پہونچانے یا نہ پہونچانے کے ذمہ دار نہیں رہتے بلکہ اکثر یہ بھی فرما دیا کرتے ہیں کہ جب نسخہ ہی ٹھیک نہ خریدا جائے گا تو فائدہ کیسے ہوگا۔ علاج کرنے سے آخر کیا فائدہ ہو' میرے نسخوں کو ہر دوکاندار نہیں سمجھ سکتا' ہمیشہ غلط دوائیں دیدیتا ہے وغیرہ وغیرہ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب اُس مریض کی طرف متوجہ بھی کم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحبان میں اک بڑا زبردست ہوتا ہے کہ ہر مرض میں دق یا سل کے جراثیم ثابت کر سکتے ہیں اور یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کہ جب کوئی مرض تشخیص ہی نہ ہو سکے تو اس کو دق بتایا جاتا ہے اور مریض کو پہاڑ پر جانے خاموش لیٹ جانے مکمل آرام کرنے عمدہ غذا کھانے وغیرہ کی ہدایتیں کر کے اپنے سر سے بلا ٹالتے ہیں بخار ہو کھانسی ہو سر میں درد ہو آنکھ دُکھنے آئی ہو' پیر میں پھوڑا ہو' پیٹ میں درد ہو' غرضکہ جو کچھ بھی ہو سب دق ہو سکتا ہے۔ مگر بشرط ضرورت۔

ایک اور بات ڈاکٹر صاحب میں عجیب ہوتی ہے اور دنیا کے ہر ڈاکٹر میں تقریباً ہوتی ہے مریض چاہے جس مرض کا ہو اور اس کی حالت جیسی بھی ہو ڈاکٹر صاحب آنکھ بند کر کے اس کو دودھ غذا میں ضرور بتا دیں گے چنانچہ مطب میں جب مریض کھانے کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے سوال کرتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کی زبان سے بلا ارادہ "دودھ" ہمیشہ نکل جاتا ہے۔ پھر مریض لاکھ کوشش کرے کہ بجائے دودھ کے کچھ اور بتا دیں مگر ڈاکٹر صاحب غذا میں دودھ کے علاوہ اور کچھ جانتے ہی نہیں' مریض پوچھ رہا ہے۔

"ڈاکٹر صاحب شلغم کھاؤں؟"

ڈاکٹر صاحب: "دودھ پیجئے' پیٹ بھر کر دودھ پیجئے' خوب پیجئے"

مریض: "ڈاکٹر صاحب دودھ نہیں پیا جاتا ہے"

ڈاکٹر صاحب: "اچھا دودھ میں سوڈا واٹر ملا کر پیجیے ورنہ قوت کم ہو جائیگی"۔

مریض۔ "سوڈا واٹر سے تو اور بھی بدمزہ ہو جاتا ہے"۔

ڈاکٹر صاحب: "پانی ملا کر دودھ پیجیے اور کچھ نہیں"۔

مگر معلوم نہیں مریض کو کبھی بیماری کے ساتھ کونسا عارضہ ہو جاتا ہے کہ یہ معلوم ہوتے ہوئے کہ صرف دودھ پینے کی اجازت ہے تمام دنیا کی چیزیں ڈاکٹر صاحب کو گنواتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب ہر چیز کے بجائے دودھ بتاتے ہیں۔ مریض جب پھلوں کے پوچھنے کا ارادہ کرتا ہے تو آم سے لے کر املی تک سب پوچھ جاتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب بھی اپنی ضد کے ایسے پکے ہوتے ہیں کہ بھولے سے بھی کوئی سوائے دودھ کے کچھ اُن کے منہ سے اور نہیں نکلتا۔ مریض خواہ کچھ پوچھتا ہے ڈاکٹر صاحب دودھ بتاتے ہیں۔ مریض روٹی مانگتا ہے ڈاکٹر صاحب دودھ فرماتے ہیں۔ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ حکیموں کا فاقہ اور ڈاکٹروں کا دودھ انکی حکمت اور ڈاکٹری کی اصل جڑ ہے۔

مکرر ارشاد

ایک تو ہوتا ہے تعریف کرنا اور ایک ہوتا ہے اشتہار دینا۔ ان دونوں میں جو لطیف قسم کا فرق ہے اس کو تجارت پیشہ طبقہ ہی خوب سمجھتا ہے۔ بہر حال میاں رفیق اپنی بیوی کی تعریف کرنے کے سلسلہ میں کچھ "المشتہر" قسم کے شوہر واقع ہوئے تھے اور مصیبت یہ تھی کہ اہلیہ محترمہ کی شان میں آپ جو کوئی تازہ قصیدہ فرماتے تھے تو وہ سر پر سوار ہو کر ہم کو سنایا ضرور جاتا تھا اور پھر اسی پر بس نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ آپ کا قصیدہ سن کر ہم بدنصیب سامعین اس گرمجوشی کے ساتھ داد دینے کے لئے مجبور کیے جاتے تھے کہ ہماری داد بجائے خود اُن ممدوحہ کی شان میں قصیدہ بن جائے بہر حال یہ حضرت اپنی بیوی کے زیادہ تر اس لئے عقیدت تھے کہ وہ ہر زہر کو شربت کی طرح پی رہی تھی اور اپنی مشرقی شرافت اور باحیائی کے ہر سخت

امتحان میں شاندار طریقہ پر کامیاب ہو رہی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو اسی لئے دنیا کی بہترین اور منتخب عورت سمجھتے تھے کہ ان کو کوئی اور عورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ مطلب کہنے کا یہ کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں مگن تھے کہ فطرت نے اُن کو دنیا کی دوسری نعمتوں سے محروم کر دیا تھا لیکن باوجود اس حقیقت کے جب وہ یہ کہتے تھے کہ میری بیوی کے مقابلہ میں اگر جنت سے کوئی حور یا پرستان سے کوئی پری بھی آجائے تو میں اس کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ تو یہ سمجھئے کہ بس ہمارے آگ ہی لگ جاتی تھی اور دل چاہتا تھا کہ ان کی اس بیوی پرستی کا بھانڈا عین چوراہے پر پھوڑ دیا جائے اور خود ان کو بتا دیا جائے کہ تم اب تک کس غلط فہمی میں مبتلا ہو۔

ملاحظہ فرمائیے کہ قتالہ عالم میری پکفورڈ کا فلم دیکھنے کے لئے ہم لوگ گئے اور ہمارے ساتھ ہی آپ نے بھی سینما کو سرفراز فرمایا۔ آپ نہایت خاموشی کے ساتھ اس خاموش فلم کو دیکھتے رہے لیکن منظر پر مسعود کی شامت جو آئی تو اس کے منہ سے نکل گیا۔

"اس ظالم کو تو فطرت نے اپنی تمام صناعیاں صرف کر کے بنایا ہے یہ حُسن، یہ جوانی اور پھر یہ بھولا پن یہ فرشتوں کی سی معصومیت، سبحان اللہ"

رفیق صاحب نے ان الفاظ کو اس طرح سنا کہ گویا اس تعریف سے ان کی بیوی کی براہ راست توہین ہو رہی ہے اور فوراً بولے:۔

مجھ کو تو اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی معلوم نہیں اس کونسی ایسی خوبی ہے کہ آپ ریشہ خطمی ہوئے جا رہے ہیں"۔

یقیناً رفیق کی یہ بات اشتعال انگیز تھی چنانچہ حامد نے فوراً منہ توڑ جواب دیا۔ "اس میں جو خاص باتیں ہیں وہ آپ کی حسن شناس نظریں دیکھ ہی نہیں سکتیں آپ خواہ مخواہ اس بدصورت عورت کو دیکھنے چلے آئے آپ کو تو صرف وہی فلم دیکھنا چاہیئے کہ جس میں آپکی گھر والی نے کام کیا ہو"۔

برہم ہو کر بولے۔ "یہاں بیوی کا تو خیر کوئی ذکر نہیں ہے مگر میں پوچھتا ہوں کہ اس بے آب و نمک عورت میں آپ کو کیا خوبی نظر آئی؟"

میں نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔ "خیر معاف کرو اور تماشا دیکھو"۔

مگر چونکہ رفیق صاحب اس کے عادی نہیں تھے کہ اس قسم کے معاملات کو ناتمام چھوڑ دیا جائے یا یونہی ٹال دیا جائے۔ لہٰذا میری پکفورڈ کی کریہ المنظری پر دھواں دھار تقریر کئے گئے یہاں تک کہ نہ تو انھوں نے خود تماشا دیکھا نہ کسی کو دیکھنے دیا ہم لوگوں میں سے ہر ایک نے فرداً فرداً اُن کے ہاتھ جوڑے اُن سے خاموش رہنے کا متفقہ طور پر مطالبہ کیا گیا۔ مسعود نے اپنے الفاظ واپس لئے مگر ان تمام باتوں کو رفیق صاحب نے قابل توجہ نہ سمجھا اور وہ ایک ایسے جوش کے ساتھ میری پکفورڈ کے خلاف زہر اُگلتے رہے کہ گویا اس حسین عورت کی پرچھائیں سے اپنی بیوی کا انتقام لے

رہ نہیں مسعود نے ان سے آہستہ عرض کیا۔

"خدا کے واسطے تماشا دیکھنے دو کیوں سب کے دام خراب کر رہے ہو۔ اور وقت جو برباد ہو رہا ہے وہ گویا اس کے علاوہ ہے۔ جانے بھی دو۔ اس عورت میں حُسن نہ سہی بدصورتی سہی مگر خدا کے لئے اس کی جان بخش دو۔"

کہنے لگے: "اے سبحان اللہ ذرا ان مسماۃ کی ہنسی تو ملاحظہ فرمایئے۔ بخدا یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی جنگلی بلی میاؤں کہہ رہی ہے۔"

محمود نے ناگواری کے ساتھ کہا: "اگر تم نہیں چاہتے کہ تماشا دیکھا جائے تو خیر چلو آخر اس تضیع اوقات سے کیا فائدہ۔"

آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: "تمہیں ماشاء اللہ ذرا اس بدتمیز عورت کے ہاتھوں کی جنبش تو دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ کھرپے سے گھاس کھودی جا رہی ہے لاحول ولا قوۃ۔"

میں نے کہا: "سنو رفیق ابھی اگر تم کچھ بولے تو آگ بجھانے کی بالٹی تمہارے اوپر استعمال کی جائے گی۔"

کہنے لگے: "سبحان اللہ خدا غارت کرے اس حسن اور اس دل فریبی کو آپ نے ترچھی نظروں کی ادا دکھا کر اپنی ڈھیری آنکھوں کا منظر بھی پیش کر دیا۔ اور یہ آپ کی چال ہے۔"

محمود اٹھ کر چلے اور ان کے ساتھ ہی رفیق کی ان بدتمیزیوں سے عاجز

آکر ہم لوگوں کو بھی اٹھنا پڑا۔ اس لئے کہ اب یہ حضرت اپنی بیوی کے جوشِ انتقام میں ہمارے علاوہ دوسرے لوگوں کی تفریح میں بھی مخل ہو رہے تھے اور وہ وقت قریب تھا کہ کوئی ان حضرت کو ڈانٹ کر ان کے ساتھ ہی ہم سب کی عزت کو خطرہ میں ڈال دیتا۔ بہرحال ہم لوگ غصہ میں اپنی بوٹیاں نوچتے ہوئے سینما ہال سے باہر آ گئے اور ہمارے ساتھ ہی رفیق صاحب بھی نہایت اطمینان کے ساتھ اس طرح چلے آئے کہ گویا کوئی بات ہی نہیں ہے حالانکہ آج صرف انہی کی بدولت ہم میں سے ہر ایک کا ایک ایک روپیہ ضائع ہوا تھا۔ سینما ہال کے باہر آ کر اس سے قبل کہ ہم لوگ کچھ کہیں خود ہمارے ممدوح نے فرمایا

"آج کے دام پھک گئے۔"

جی میں تو یہی آتا تھا کہ بھائی رفیق صاحب کو ہم سب مل کر کھا جائیں لیکن تعجب ہے کہ ہم میں سے ہر ایک نے خلافِ عادت ضبط سے کام لیا اور کسی نے ان کو کوئی جواب نہیں دیا لیکن غالباً وہ خود چاہتے تھے کہ کوئی ان سے الجھا جائے۔ لہٰذا آپ نے گل افشانی فرمائی۔

"بڑی قتالۂ عالم کی بچی بنی ہے نہ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل اگر واقعی کچھ ہوتیں تو خدا جانے کیا آفت ڈھاتیں۔"

اب تو مسعود سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے بغیر ڈکار لئے نگل جانے

کے انداز سے کہا: "آپ تو ہیں اندھے 'بیوقوف کہیں کے' اپنے سڑی پن کے پیچھے ہم سب کو پریشان کیا ایسا اچھا فلم اور اس کو اس طرح غارت کیا ہے"۔

محمود نے بھی جلے پھپھولے پھوڑے: "جی ہاں بس مصیبت تو یہ آگئی تھی کہ ایک عورت کو ان کی بیوی کے ہوتے ہوئے حسین کیوں کہہ دیا گیا ان کی پریجمال بیگم صاحبہ اس سے بھی اچھی ہیں"۔

رفیق نے ترکی بہ ترکی کہا: "تو کیا کچھ جھوٹ بھی ہے میں مذاق نہیں کر رہا ہوں بلکہ سچ کہتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کر کے کہتا ہوں کہ میری بیوی اس عورت سے لاکھ درجہ اچھی ہے۔ آپ نے بھی اس کو میری بیوی سے ملایا ہے کیا خوب؟ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک"۔

میں نے کہا: "اچھا رفیق ایمان سے بتاؤ کہ اگر تم کو میری پکفورڈ مل جائے تو تم کیا کرو"۔

اکڑ کر کہنے لگے: "اماں لاحول ولاقوۃ' میں تو ماشاءاللہ اس سے پیر بھی نہ دبواؤں۔ پاخانے میں پانی بھی نہ رکھواؤں"۔

مسعود نے جل کر کہا: "یہ منہ اور مسور کی دال ع
"اس آرزو کو دیکھئے اور ان کو دیکھئے"

محمود نے کہا: "جی ہاں اگر ابھی میری پکفورڈ آجائے اور آپ کو محض اس خدمت کے لئے ملازم رکھ لے کہ آپ اُس کے کتوں کو غسل کرا دیا کریں

تو آپ کے یہ تمام دعوے دھرے رہ جائیں گے اور آپ اپنے اسی عہدے کو سلطنت سمجھیں گے"۔

رفیق نے ان پیہم حملوں سے پسپا ہو کر کہا: "اچھا خیر یہی سہی آپ لوگ تو میری پکفورڈ آجائے طرفدار ہیں کہ اس کی شان میں ذرا سی بھی گستاخی کے متحمل نہیں ہو سکتے معلوم یہ ہوتا ہے کہ گویا اس کے معتقد ہیں مرید ہیں یا نمکخوار ہیں۔ بہرحال اب ہٹائیے اس قصہ کو"۔

ہم لوگوں نے بھی بات کو ٹال کر اپنا اپنا راستہ لیا۔ لیکن مسعود اس واقعہ سے کچھ ایسا مشتعل ہو چکا تھا کہ وہ سیدھا رفیق کے گھر پہونچا اور اس سے قبل کہ خود رفیق گھر پہونچے اس نے رفیق کی بیوی سے ایک عجیب پروگرام طے کر لیا اور اس کے بعد ہم سب کو اُس پروگرام کی اطلاع دے کر اپنے گھر گیا۔

دوسرے ہی دن ہم سب نے رفیق کو اپنے ساتھ لیا اور بنارسی باغ کی طرف چل دیئے۔ رفیق آج بھی بیوی نامہ کی تلاش میں مصروف تھا اور ہم سب آج غیر معمولی طور پر اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے یہاں تک کہ اُس نے بنارسی باغ کی ایک روش پر بیٹھتے ہوئے کہا: "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دنیا کی حسین سے حسین عورت میرے لئے ناقابل توجہ ہے اور میری نظر میں کسی کا حسن اُس وقت تک نہیں سما سکتا جب تک کہ میری بیوی کا معصوم حسن میری نظروں میں جگمگا رہا ہے"۔

عین اُسی وقت اس روش کے قریب ہی سڑک پر ایک تانگہ آکر ٹھیرا اور ایک برقعہ پوش نازنین اس پر سے اُتر کر قدم قدم پر گُل کھلانے لگی۔

محمود نے چپکے سے کہا: "ذرا دیکھنا یہ ہے خرام ناز کی چلتی پھرتی تصویر"

مسعود نے کہا: "واقعی اس وقت تو یہ خاتون بہار کی دیوی معلوم ہو رہی ہے۔ حالانکہ برقعہ میں ملفوف ہے مگر رعنائیاں پھٹی پڑتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یقیناً برقعہ اس کے حسن کا متحمل نہیں اور اس کی یہ بیساختہ ادائیں اس کو اور بھی حسین ثابت کر رہی ہیں۔ دیکھو وہ اُس نے ایک پھول کو اپنے ہاتھ میں لے کر سونگھا مگر سونگھ کر چھوڑ دیا توڑا نہیں۔ یقیناً یہ اُس نے ایک شعر کہا ہے۔"

اس وقت میاں رفیق مہر بلب آنکھیں پھاڑے ہوئے اُس حسینہ کو دیکھ رہے تھے کہ اُس نے غور سے آپکی طرف دیکھا اور اسی ایک خفیف سی توجہ نے آپ کا قلع قمع کر دیا۔ کہنے لگے "دیکھو تو سہی وہ تو اسی طرف دیکھ رہی ہے"

محمود نے کہا: "ہم کو یہاں سے ہٹ جانا چاہئے تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ تفریح کر سکے"

میں نے بھی تائید کی اور مسعود نے بھی کہا کہ واقعی ہم اس وقت اسکی تفریح میں مخل ہو رہے ہیں۔"

مگر رفیق بدستور حیرت بنے ہوئے گھاس پر بیٹھے رہے یہاں تک

کہ ہم لوگ وہاں سے ہٹ کر چلے گئے اور ایک جھاڑی کی آڑ سے اس روش کے مناظر دیکھنے لگے جہاں وہ برقعہ پوش خاتون محو خرام تھی اور رفیق محو تماشا وہ خاتون ٹہلتے ٹہلتے اس جگہ کے قریب آگئی تھی جہاں رفیق رفیق کارٹون بنے ہوئے بیٹھے تھے اور اب آپ بھی اپنی حیرت سے چونک کر سنبھل چکے تھے کہ اس خاتون نے آپ کو اپنی طرف مخاطب کر لیا اور آپ نہایت فدویانہ انداز سے دست بستہ کھڑے ہو گئے اس خاتون نے آپ سے کچھ کہا اور آپ نے اس کا کچھ جواب دیا لیکن ہم لوگ فاصلہ کی وجہ سے اس راز و نیاز کو نہ سُن سکے بہرحال چند ہی منٹ کے بعد وہ خاتون وہاں سے چلی گئی اور رفیق کچھ دیر تک لاوارث مال کی طرح گھاس پر پڑے رہنے کے انداز سے کھڑے رہنے کے بعد ہم لوگوں کی تلاش میں رہے۔ اور ادھر ہم لوگ بھی اس طرح ایک بنچ پر بیٹھ گئے گویا سب بحمداللہ خیریت ہے۔

رفیق نے آتے ہی اپنے کو بنچ پر گراتے ہوئے کہا: "یہ لوگ لوگ آخر کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

مسعود نے جواب دیا: "یہ بھی کوئی شرافت تھی کہ ایک شریف زادی ہماری وجہ سے تفریح نہ کر سکے اور ہم وہیں پر ڈٹے رہیں۔"

کہنے لگے: "مگر معلوم بھی ہے یہ کون صاحبہ تھیں؟"

میں نے کہا: "ہوں گی کوئی بہرحال برقعہ پوش تھیں اور تنہا تھیں ہم کو

ہی چاہیئے تھا کہ ہم ان سے علیحدہ رہیں تاکہ وہ آزادی کے ساتھ تفریح کر سکیں کہنے لگے "سنو تو سہی میں نے تو اُن سے دوستی کر لی"۔

ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ "دوستی کر لی؟"

کہنے: "ہاں ہاں دوستی کر لی۔ ہوا یہ کہ جب تم لوگ ادھر چلے آئے تو وہ بیچاری میری طرف بڑھی اور میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ یہ تم لوگوں کی وجہ سے اب تک دور ٹہل رہی تھی چنانچہ یہی ہوا کہ وہ میرے قریب آ گئی اور اُس نے مجھ کو خود ہی مخاطب کر کے پوچھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو اُس نے بھی بتایا کہ وہ کون ہے اور اُس نے یہ بھی کہا کہ میں روزانہ اسی مقام پر ٹہلنے آیا کرتی ہوں مگر آج یہ پہلا اتفاق ہے کہ آپ جاذب توجہ ثابت ہوئے اس کے بعد کچھ شرما کر کہنے لگی کہ اگر ہم اور آپ دونوں ایک وقت مقرر کر لیں تو روزانہ ملاقات ہو سکتی ہے۔

میں نے کہا: "مگر یہ تو بتا یار کہ وہ تھی کون؟"

لاپروائی سے کہنے لگے: "اس سے تم کو کیا مطلب بہرحال نہایت معزز خاتون ہے اور نہایت ہی معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ خاندان کا نام بتانا مناسب نہیں ہے۔"

مسعود نے کہا: "کیوں صاحب اب ہم سے بھی پردہ داری ہو گی؟"

مسکرا کر بولے: "نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ اُس نے اپنی جان کی قسم دی ہے۔"

محمود نے کہا: "اللہ اللہ جان تک کی قسما قسمی ہو چکی ہے۔ یہ کہئے کہ یہ قصہ ہے۔"

مسعود نے کہا: "بھائی اب تم کیوں ہم غریبوں کو پوچھو گے جبکہ خدا نے تم کو سونے کی چڑیا کا چڑی مار بنایا ہے۔"

نہایت اطمینان سے فرمایا: "کل تم لوگوں سے بھی ملاقات کرا دوں گا مگر ایک شرط ہے کہ اس پارٹی کے باہر یہ بات جانے نہ پائے۔"

ہم لوگوں نے اُن سے پختہ وعدہ کر لیا اور اسی خوشگوار صحبت پر مبادلہ خیال کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ معلوم نہیں اس کے بعد بیدار ہو گئے یا اور تمام رات کس طرح کٹی بہر حال دوسرے دن وہ تمام دنیا کا حُسن اور زمانہ بھر کی زینتیں اپنے اوپر اُنڈیل کر وقت سے بہت پہلے ہم لوگوں کے ہمراہ بنارسی باغ پہونچے اور جس وقت ان کی برقعہ پوش خاتون تشریف لائیں آپ نے ہم سب کا تعارف اُن سے کرا دیا۔ اس کے بعد سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ روزانہ بنارسی باغ کا طواف رفیق کے لئے فرائض میں داخل ہو گیا کہ آندھی آئے یا پانی برسے طوفان آئے یا قیامت برپا ہو لیکن میاں رفیق اپنے مقررہ وقت پر بنارسی باغ میں چرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اور کبھی ہم لوگ بھی ہم لوگ بھی اس دل والے کے ساتھ "پاسبانِ عقل" کی طرح ہوتے تھے اور کبھی کبھی "ان کو "تنہا" بھی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ بہرحال یہ پُرلطف سلسلہ اسی طرح جاری تھا اور عشق کے اندھے رفیق کا اب یہ حال تھا

کہ اسکو ہر طرف محبت ہی محبت اور عشق ہی عشق اور برقعہ ہی برقعہ نظر آتا تھا ہم لوگ منتظر تھے کہ اس سلسلہ کی کوئی دلچسپ کڑی ہاتھ آئے کہ ایک دن خود میاں رفیق نے ہم لوگوں سے نہایت رازدارانہ طریقہ پر کہا۔

"یہ تو بتاؤ کہ آخر اب کیا کیا جائے؟"

مسعود نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا: "کیوں؟ کیا ابھی سے تھک گئے؟"

رفیق نے مسکرا کر جواب دیا: "یہ بات نہیں ہے بلکہ اب تو صورت کچھ ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ بغیر میرے زن ہی نہیں کر سکتی"۔

محمود بولے "تو پھر مبارک باشد اللہ نے ملائی جوڑی"۔

رفیق نے سنجیدہ ہو کر کہا: "نہیں اب یہ معاملہ مذاق کی حد سے گزر گیا ہے اور پریشان ہوں کہ آخر اس کا کیا علاج کیا جائے"۔

میں نے کہا: "نکاح کر کے دوسرا محل آباد کرو"۔

ہنس کر بولے: "ہاں بس یہی ایک ترکیب ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی فوراً آمادہ ہو جائے گی۔ مگر کیا؟"

کہنے لگے: "قصہ یہ ہے کہ اول تو اتنی حیثیت نہیں کہ دو گھر بسائے جائیں دوسرے ذرا بیوی کی بھی فکر ہے"۔

میں نے پوچھا۔ "بیوی کی فکر کیا معنی؟"

فرمایا۔ بیوی کی فکر یہی کہ وہ کیا کہے گی اور اس کو کس قدر صدمہ ہوگا۔

بات یہ ہے کہ سوت ہر حال میں سوت ہوتی ہے اور اس کا صدمہ تو ہوتا ہی ہے۔

مسعود نے کہا: "خیر یہ بات تو عارضی شروع شروع میں سب کچھ ہوگا پھر رفتہ رفتہ مساوات ہو جائے گی"۔

محمود نے کہا "دوسرے تم کو بیوی کی اس معاملہ میں پروا بھی نہ کرنا چاہیے اس لئے کہ جب تک تم سے ہو سکا تم نے ان کی پرستاریاں کیں اور قدر واقعی کیں اب ان کا عروج ختم اور دوسری دیوی کی پوجا شروع"۔

کہنے لگے: "بہرحال جو تم لوگ رائے دو مگر یہ دو گھر کیسے چلیں گے؟"

میں نے کہا: "خیر اس کی تو تم فکر نہ کرو اس لئے کہ تمہارے دوسرے محل کی ذمہ داری ہم خادموں کے سر ہوگی"۔

رفیق نے خوش ہو کر مگر تکلفاً کہا: "ارے نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم لوگ میری وجہ سے ایک اور مصیبت کا اضافہ کرو"۔

مسعود نے کہا: "خیر آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ بہرحال اس طرف سے آپ بے فکر رہیں اور اب اپنا پیغام دے دیں"۔

رفیق اس کے لئے بالکل تیار ہو گئے اور یہ طے پا گیا کہ دوسرے دن میری معرفت برقعہ پوش خاتون کو رفیق کا پیغام دیدیا جائے گا اور [illegible] کہ جس قدر جلد ہو سکے گا طے کر دیا جائے گا۔ چنانچہ دوسرے [illegible] باغ میں مقررہ مقام پر برقعہ پوش خاتون کو بجائے رفیق کے

ہوا ملا' اور جیسے ہی وہ تشریف لائیں میں نے ان سے گفتگو شروع کر دی کچھ دیر تک گفتگو کرنے کے بعد میں نے رفیق کو آواز دی اور مسعود اور محمود کو بھی بلایا رفیق گردن جھکائے ہوئے اور مسعود اور محمود ہنستے ہوئے آپہونچے تو میں نے رفیق سے کہا:۔

"رفیق میاں میں نے تمہارے متعلق ان محترمہ سے گفتگو کی لیکن یہ چاہتی ہیں کہ اس سلسلہ میں ہم لوگوں کے سامنے خود تم سے کچھ سوالات کریں"

رفیق نے ایک عجیب فدویانہ مسکینی کے ساتھ کہا: "میں تیار ہوں"

برقعہ پوش خاتون نے مجھ سے کہا: "میں ان سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ جب ان کی پہلی بیوی موجود ہیں تو ان کو دوسری شادی کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟"

اس سوال کا جواب بجائے رفیق کے خود میں نے کہہ دیا کہ "ضرورت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ یہ پوچھئے کہ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے اس طرف توجہ کیونکر مبذول فرمائی گئی"!

خاتون نے کہا: "اچھی یہی سہی اسی کا جواب دلوایئے"!

رفیق صاحب نے بچے لگاتے ہوئے فرمایا: "اس کا جواب میرے دل سے پوچھئے کہ آخر وہ کیونکر اس طرف سے پھر کر ادھر آگیا"۔

خاتون نے کہا: "اچھا اگر آپ کا دل ایسا ہی بے لگام ہے تو اس طرف

سے پھر کر کسی اور طرف بھی آسانی سے جا سکتا ہے"!

آپ نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ تو . . . . ہاں ہوں . . . یعنی ایسا تو . . . . . . جو اللہ مالک ہے"۔

خاتون نے کہا: "میں سمجھی نہیں کہ آپ نے کیا فرمایا"!

آپ نے پھر شپٹاتے ہوئے فرمایا: "مطلب یہ کہ۔ وہی جو میں نے

آپ نے شپٹاتے ہوئے فرمایا:۔

مطلب یہ کہ ــــ وہی جو میں نے عرض کیا کہ مجھ کو جب تک اپنی بیوی سے محبت رہی کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوا لیکن جب نفرت ہوئی تو . . . . تو . . . . . آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں"۔

خاتون نے پوچھا۔

"آخر نفرت کی وجہ؟"

آپ نے فرمایا۔

"کچھ یونہی میرا دل ان کی طرف سے ہٹ گیا وہ سخت بدتمیز ہیں ہے، گستاخ ہے، نالائق ہے، جاہل ہے، وغیرہ وغیرہ"

خاتون نے ہنس کر کہا:۔

"فرض کر لیجئے کہ میں بھی ویسی ہی ہو جاؤں تو"!

رفیق نے کہا:

"خدا نہ کرے آپ کا۔ اس کا کیا مقابلہ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہو بھی تو یہ میری قسمت"۔

خاتون نے کہا:

"اچھا جناب اب ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ میرے ساتھ عقد کے بعد آپ کو اپنی پہلی بیگم صاحبہ سے قطع تعلق کرنا پڑے گا"۔

رفیق نے بغیر سوچے سمجھے ہوئے جلدی سے کہہ دیا:

"سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے"

ہم سب نے حیران ہو کر پوچھا: "یعنی تم اس کے لئے تیار ہو ناکہ اپنی بیوی کو طلاق دیدو؟"

کہنے لگے۔

"اگر یہی شرط ہے تو میں اس کے لئے تیار ہوں"۔

خاتون نے کہا: "اچھا تو اب میں آپ کی ادر آپ میرے مگر اب میں ایک اجازت چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ میں آپ کے ان احباب سے پردہ کروں گی"۔

رفیق نے خوشی کے مارے بیخود ہو کر کہا:۔

"ہرگز پردہ نہ کرو قطعاً نہ کرو۔ یہ سب میرے بھائی ہیں"۔

برقعہ پوش خاتون نے یہ سنتے ہی اپنا برقعہ اُتار دیا اور رفیق صاحب اپنے اس دوسرے محل کو بے نقاب دیکھ کر اس طرح اُچھل پڑے گویا کسی بچہ نے سوتے میں "جوجو" کا خواب دیکھا ہے اور اس کے بعد منہ کھول کر مبہوت کھڑے ہو گئے۔

خاتون نے کہا: "اب آپ چپ کیوں کھڑے ہیں۔ اگر مجھ سے آپ کو نفرت ہے، اگر میں بدتمیز نالائق اور گستاخ ہوں تو اب مجھ کو طلاق دیکر کسی برقعہ پوش سے اپنا گھر بسائیے۔ میں نے آپ سے یہ تمام مذاق اسلئے جائز رکھا کہ اپنے متعلق آپ کے صحیح خیالات کا اندازہ کر سکوں اور آپکے بڑے بڑے الفاظ سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہوں۔ بہر حال وہ تمام باتیں معلوم ہو گئیں اب میں مطمئن ہوں اور مجھ کو معلوم ہے کہ میں کس جگہ پر ہوں"۔

ہم لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"میاں رفیق اپنی ہی بیوی سے دوسرا عقد دراصل "قند مکرر" ہوتا ہے"۔

سودیشی ریل

دن بھر کے تھکے ماندے بھی تھے اور رات کو سفر بھی درپیش تھا مگر "بندے ماترم" کے نعروں پر کان کھڑے کر لینا ہماری ہمیشہ کی عادت ہے۔ اور ان نعروں کو بھی یہ مرض ہے کہ ہمارا چاہے جو حال بھی ہو ہم بیمار ہوں یا کسی ضروری کام سے باہر جا رہے ہوں یا اور کوئی مجبوری ہو مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے اور اپنی طرف ہم کو کشاں کشاں کھینچ کر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ حقہ کا نیچا اور صراحیاں ایک دوکان پر یہ کہہ کر رکھ دیں کہ "بھائی ابھی آتے ہیں" اور سیدھے پنڈال میں گھس گئے۔ جہاں ایک صاحب جو صورت سے لیڈر معلوم ہوتے تھے۔ یعنی سر پر گاڑھے کی کالی کیپ ڈاڑھی مونچھ سے فارغ البال ایک لمبا سا کھدر کا کرتہ، ٹانگوں میں دیسی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ اپنی پشت پر رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف

اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بینڈ کو حرکت دیتا ہے وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے۔ مگر معلوم نہیں کیا۔ اس لئے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے۔ کبھی مغرب کی طرف اور کبھی کبھی ایک دم سے پیچھے بھی مڑ جاتے تھے۔ بہرحال یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف ہیں یا سامنے اس لئے مشکل تھا کہ ان کو خود قرار نہیں تھا وہ تخت جس پر کھڑے ہوئے وہ گھوم رہے تھے مجمع کے وسط میں تھا اور تمام مجمع کا رخ تخت کی طرف کبھی کسی کی طرف منہ کبھی کسی کی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ اور اسی طرح ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف کبھی دور کی آواز کی طرح اور کبھی بالکل نہیں ہمارے کانوں میں پہنچ رہے تھے ہاں ایک بات یہ بھی کہ ہماری طرف کے لوگ غل مچانے میں اُتر دکھن اور پچھم کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے اس لئے ہم تقریر سننے کے معاملہ میں ذرا گھاٹے میں تھے۔ پھر بھی جو کچھ سنا وہ بہت کافی تھا اس لئے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں کبھی اُردو میں۔ کبھی نثر میں کبھی نظم میں۔ کبھی ہنس کر، کبھی چیخ کر، کبھی ادھر مُڑ کر کبھی ادھر گھوم کر وہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم نے سُن لئے تھے۔

بھائیو! اب وہ وقت نہیں ہے کہ رزولیشن پاس ہوں اور رہ جائیں ..... تجاویز منظور ہوں اور شرمندۂ عمل

زمیں ۔۔۔۔ سرگریباں ۔۔۔۔ اب تیار ہو جاؤ ۔۔۔۔۔ ہوشیار رہو ۔۔۔۔ کہ تم کو ۔۔۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء ۔۔۔۔۔ کے بعد اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے ۔۔۔۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔ ۔۔۔ (دوسری طرف گھوم گئے) ۔۔۔ خواب غفلت سے بیداری کا وقت ۔۔۔۔ یہ ہے ۔۔۔ اور ہاں تم ۔۔۔ برٹش گورنمنٹ ۔۔۔ سوراج سودیشی ۔۔۔ چرخہ ۔۔ کھدر ۔۔ (چیئرز کے بعد تقریر ختم)

دو گھنٹہ میں ہم نے صرف یہی سنا اور سمجھ لیا کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا غالباً اس سے زیادہ انھوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی ہو تو ہم کیا کریں ہمارے لئے یہی بہت تھا کہ ۳۱ر دسمبر کو سوراج بٹ گا۔ ہم اسی خیال میں غرق مجمع کو دھکیلتے خود دھکے کھاتے کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے دوکان پر سے حقہ کانیچا لیا۔ صراحیاں تکیے پر لادیں اور آرام کرسی پر لیٹ کر شوق فرمانے لگے۔ گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے اس لئے اطمینان بھی نصیب تھا مگر احتیاطاً شیروانی نہیں اتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے گا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

لیکن یہ خیال اور ۳۱ر دسمبر کے بعد سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کے لئے ۳۱ر دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے اگر آج ۳۱ر دسمبر ہوتی تو ہم اپنی ریل پر سفر کرتے نہ بدیشی گارڈ ہوتا نہ فارن ڈرائیور نہ اینگلو انڈین کا علیحدہ درجہ ہوتا ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے چاہے تھرڈ میں بیٹھتے، چاہے فرسٹ میں ہم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا، ہم خود فرسٹ میں بیٹھتے اور انگریزوں کو تھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوئے سفر کرتے ۔۔۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ایکدم سے کان میں پھر وہی "بندے ماترم" کی آواز آئی اور ہم ایکدم سے کھڑے ہو گئے۔ گھر کے باہر نکلے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں جھنڈیوں اور گیسوں سے سجا ہوا "بندے ماترم" کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ہلاتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گذر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ "بھائی یہ کیا ہے؟" جواب ملا کہ "کیا سو رہے تھے؟ خبر نہیں کہ سوراج مل گیا؟" ہم نے پھر بڑا سا منہ کھول کر کہا۔ "سوراج؟" جواب ملا۔ "ہاں سوراج! سوراج!" ہم نے اپنے دل میں کہا کہ "واہ بھئی واہ دعا تو قبول ہوئی ہماری اور سوراج مل گیا ان لوگوں کو ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی پھر سوچا کہ ہم اور یہ لوگ کچھ غیر تھوڑی ہیں۔ ان کو ملا یا ہم کو ایک ہی بات ہے۔ مگر واللہ کمال ہوا کہ سوراج مل گیا۔ دل کو کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سوراج مل گیا۔ حالانکہ ابھی تک جلوس نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا جب جلوس

کی طرف نظریں جاتیں تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا اور جیسے راج ملنے پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج ملنے کی خوشخبری سُنائی تو شک دور ہوا اور ایک آزادانہ و خود مختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا ابھی ہم اپنے کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹہ نے ٹن ٹن کر کے دس بجا دیے یعنی ہم کو خود اسٹیشن چلے جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لئے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں چنانچہ ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا اسٹیشن پہونچ کر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا:۔

"بابو جی! کانپور کا سکنڈ کلاس ٹکٹ دیدیجئے!"

بابو جی نے بجائے اس کے کہ ٹکٹ دیتے پہلے تو ہم کو گھورا پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے۔

"ایک بات کہدیں یا مول تول؟"

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں۔ اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے

پر بابو جی نے پھر کہا:۔

"جناب سُنئے تین روپیہ ہوئے لائیے روپے اور ٹکٹ لیجے"۔

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا:۔

جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنے تو کرایہ ہے آپ کہتے ہیں تین روپے مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہئے ہے۔ کانپور کا سکنڈ کلاس۔

بابو جی نے ذرا ترش رو ہو کر جواب دیا

"جناب والا! میں بہرا نہیں ہوں سُن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیئے ہے۔ مگر اسی کے تین روپے ہوئے، کوڑی کم نہ لوں گا جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجئے"۔

میں:۔ "مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنہ کرایا تھا آج کیا ہو گیا کہ ایکدم بڑھ گیا"۔

بابو:۔ "کل کی بات کل کے ساتھ۔ آج دیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ہے"

میں:۔ "یہ کیسا سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجئے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی"۔

بابو۔ "لائیے روپے"۔ "اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دیدیجئے اور ٹکٹ لے لیجئے"۔

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصّہ آ رہا

تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کر دوں گا۔ اور یہ سوچ کر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی۔

"سنیے تو جناب۔ ٹھیریے تو جناب۔ دیکھیے تو جناب۔ اچھا دو روپے دید یجیے۔ آئیے وہی ایک روپیہ تیرہ آنے دید یجیے۔۔۔۔۔۔ اب وہ بھی نہ دیجیے گا۔؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے۔ لائیے۔ ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کر سکتے ہمارا نقصان ہو رہا ہے"۔

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا گردن ترچھی کر کے وہیں سے کہہ دیا۔ "ایک روپیہ دیں گے۔ ایک روپیہ کو دینا ہو دیدو"۔

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے مگر واللہ کمال کیا انھوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے۔

"لائیے صاحب لائیے۔ بوہنی کا وقت ہو۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہو۔"

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا۔ لیکن وہ ٹکٹ ریل کا ٹکٹ معلوم نہیں ہوتا تھا نہ اس پر تاریخ پڑھی ہوئی تھی اور نہ اس پر کچھ چھپا ہوا تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر "درجہ دوم کانپور" لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر

کھینچ دی تھی جو غالباً اُن کے دستخط تھے۔ ہم نے ٹکٹ کو ادھر سے دیکھا اُدھر سے دیکھا اور دو تین مرتبہ غور سے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ بابو صاحب بھی ذرا قیافہ شناس تھے۔ ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے۔ اور متبسم ہو کر کہنے لگے۔

"جناب والا رات کو سوراجیہ ملی ہے ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں۔ وہ دو تین دن میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب۔ آپ تو سفر کیجیے اب آپ سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھیے"۔

بابو صاحب نے تسلی تو دیدی۔ مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ ہے نہ کرایہ، نہ فاصلہ، اور فاصلہ ہوتا تو کہاں سے انھوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ سمجھ کر کہ یا تو یہ روپیہ گیا یا ہم تیرہ آنہ کے نفع میں رہے۔ ہم اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سامان کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے یا اُلٹا باندھ کر لٹکا دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی وہی گھڑیال مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے۔ حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ اسباب کے ٹھیلے پر پان والا اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا۔ قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہونچائیں

بمشکل تمام ایک قلی ملا۔ لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اُٹھانے کو کہا اُس نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا:۔

"اندھے ہو گئے ہو، دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر" ہم "معاف کیجئے گا غلطی ہوئی" کہہ کر پورے پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے اور اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ "یا اللہ یہ کیا انقلاب ہے پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو پھر قلی کس صورت کا ہوگا؟ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اُٹھایا اور دو مرتبہ کر کے سکنڈ کلاس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے اسباب قرینہ سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہئے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور؟ سب سے پہلے تو ہم نے انہی حضرت سے پوچھا کہ جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے لیکن انھوں نے صرف یہ جواب دیا "کا جانی بھیا ہم کا ناہیں مالوم" یہ خالص سودیشی ریل کے سکنڈ کلاس کے معزز پسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائے گی اسی لئے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف" ہم نے گھبرا کر پوچھا:۔

"لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا؟"

جواب ملا کہ "جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے"۔

ہم نے پھر پوچھا "لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا"۔

جواب ملا کہ "ہو جایا کرے جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟"

اب ہم بالکل راضی برضا ہو کر خاموش ہو گئے، اس انتظام کو برا اس لئے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دعا تھی اچھا اس لئے نہیں کہتے تھے کہ آج ہی کانپور پہونچنا تھا جس کی اب کوئی اُمید بظاہر نہیں معلوم ہوتی غرضکہ کبھی اپنے ڈبہ میں بیٹھ کر کبھی لوٹے میں پانی لا کر کبھی پلیٹ فارم پر ٹہل کر کبھی انجن کو مشرق اور مغرب کی سمت حد نظر تک ڈھونڈھ کر کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹنے لگے۔ گیارہ سے بارہ بارہ سے ایک ایک سے دو بجے مگر نہ گھڑی کی سوئی ہٹی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی۔ صرف ہم ٹہلتے رہے۔ خدا خدا کر کے ایک آدمی نے بآواز بلند چیخنا شروع کیا۔

"بیٹھنے والے مسافر بیٹھو گاڑی چھوٹتی ہے"۔

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈھا پھر مغرب کی طرف، مگر دونوں طرف انجن غائب تھا۔ اور ہماری بالکل سمجھ میں نہ

آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے اور ان الفاظ پر شک کرنا اس لئے کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی غیر ذمہ دار شخص نہ تھا بلکہ وہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب تھے۔ جن کو ہم قلی سمجھتے تھے ہر حال بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے ہمارے بیٹھتے ہی دو تین درجن لٹھ بند گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے اُن سے ہم نے لاکھ کہا۔ ارے سکنڈ کلاس ہے۔ اماں سکنڈ کلاس ہے۔ اماں سکنڈ کلاس ہے۔ بھائی سکنڈ کلاس ہے۔ مگر اُنھوں نے ایک نہ سُنی اور یہی کہتے رہے۔ ہم ہو جانت ہے ڈیوڑھا ہے۔ ہم ہو ٹکس لیا ہے۔" خیر صاحب ہم چُپ ہو رہے اور پلیٹ فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہہ دیں مگر گارڈ وارڈ نظر نہ آیا مجبوراً انھیں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب سے عرض کر دیا جس کا جواب انھوں نے اپنی سودیشی شان سے صرف یہ دیا "بیٹھئے جناب سب ہندوستانی برابر ہیں۔ سب بھائی سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں۔ کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔ اب سکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے فرق کو بھول جائیے سب کو برابر کا سمجھئے، جائیے تشریف رکھئے۔ نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی۔ ہم یہ کھرا جواب سن کر منہ لٹکائے ہوئے اپنے درجہ میں آگئے جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا۔ اور ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ کھڑے کھڑے سفر طے ہوگا یا غسل خانہ میں جگہ ملے گی مجبوراً اپنا ٹرنک گھسیٹ

کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا مگر گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پھر پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن گاڑی میں لگایا جا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کانپور ہی کی طرف لگایا جا رہا ہے۔ لیکن انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا معلوم ہوا کہ "ابھی سکریٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے وہ کانپور جائیں گے۔ انھوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آجائیں گے ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی بلانے کے لئے گیا ہوا ہے۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا ایک روپیہ سے صبر کر کے ارادہ ملتوی کر دیں۔ کام اتنا ضروری تھا اسلئے جانا ضروری تھا۔ گاڑی چھوٹتی نہ تھی اس لئے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کشمکش میں جان تھی معلوم نہیں وہ کونسا وقت تھا جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی۔ اب تو اسکو واپس کرنا بھی مشکل تھا اس لئے کہ کفران نعمت کا الزام بھی تو ہم پر لگا دیا جاتا۔ ہم اسی غم و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے "بندے ماترم" کے فلک شگاف نعروں سے اُچھل پڑے معلوم ہوا کہ سکریٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے ہیں۔ ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا

تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دیے جنھوں نے رات کو تقریر کرکے سوراج دلوایا تھا۔ اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سکریٹری ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرضکہ اُن کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی سن سن کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش چپل زیر پا بزرگوار لال اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لئے ہوئے بھی نمودار ہوئے۔ اور ہم نے اپنی جگہ پر سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی۔ اور پہلے سُرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے غلطی سے سُرخ جھنڈی ہلادی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ "گھنٹہ سیٹی بجا رہا ہوں۔ مگر تمھارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔"

ڈرائیور نے بھی اُن کے بیجا غصہ کا جواب کڑک کر دیا۔ "جناب آپ آنکھیں بے کیوں نکال رہے ہیں میرا کیا قصور ہے۔ دو گھنٹہ سے للّو فائرمین کو کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ کہدیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آؤ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ پتا بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جاکر مر رہا اب بتائیے میرا کیا قصور ہے۔" گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر

چپ ہو گئے اور کوئلے کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن میں یہ بڑی بات ہے کہ وہ بغیر کوئلے کے چل ہی نہیں سکتا۔ جس طرح گھوڑے کے لئے دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو تھوڑی دیر بھوکا بھی چل سکتا ہے لیکن یہ اتنا بھی کام نہیں دے سکتا۔ اب بتائیے کہ ریل بھی تھی انجن بھی مسافر بھی تھے۔ گارڈ بھی، سکریٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی آگئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد للّو فائرمین کوئلہ کی گٹھری لئے یہ کہتا ہوا آپہنچا:-

"آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں۔ تمام دُکانیں بند ہو چکی تھیں ایک دُکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ نو آنہ میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آرہا ہوں، راستہ میں گر بھی پڑا تھا تمام گھٹنے چھل گئے کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔"

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی گاڑی چلی ہی تھی کہ شور مچ گیا۔ "روکو، روکو گارڈ صاحب رہ گئے" گاڑی پھر رُکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہوگی کہ گاڑی پھر رُکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلا چلا کر پوچھنا شروع کیا۔ "ارے لائن کلیر بھی لے لیا تھا..... "لائن کلیر" ڈرائیور نے بھی چلا کر

جواب دیا: "لے لیا تھا۔۔۔ لے لیا تھا۔۔۔" گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی استعمال کر لیا تو پھر فرمایا: "اچھا تو چھوڑ دو گاڑی میں سیٹی بجاتا ہوں"۔ گاڑی پھر چلی۔ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس، اس لئے کہ اس کی رفتار سے زیادہ تیز شاید ہم خود چل لیتے اور اگر ابھی شرط بد کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہونچنے کا وعدہ کرتے ہیں ہم سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک شریک سفر سے پوچھا: "کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس" وہ پہلے ہی سے کچھ خفا بیٹھے تھے غالباً گاڑی پر ہوں گے غصہ ہم پر اُتارا اور بھڑک کر فرمانے لگے: "میاں خدا کا شکر سمجھو کہ یہ گاڑی ہی ہے۔ تم میل ایکسپریس لئے پھر رہے ہو"۔ ان کا جواب سُن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی مگر سیر سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے نئے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے جاتے تھے اور گاڑی سے اُترتے تھے پیشاب کرتے تھے اور پھر دوڑ کر سوار ہو جاتے تھے اور گاڑی چھک چھک چل رہی تھی۔ اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پر رُکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ:۔

"جب تک میں نے سگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن میں گاڑی لانیکا کونسا حق تھا"

ڈرائیور: "جب آپ نے گاڑی آتے دیکھ لی تھی تو سگنل کیوں نہیں دیا"۔

اسٹیشن ماسٹر۔ ایک تو گاڑی لے آیا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا۔ دوسرا ڈرائیور رکھ لوں گا جو مجھ سے گستاخی کی۔ اگر گاڑی لڑ جاتی تو تمہارا کیا جاتا، آئی گئی سب ہم پر آتی"۔

ڈرائیور۔ دیکھئے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے باتیں کیا کیجئے نوکری کی ہے عزت نہیں بیچی ہے۔ بڑے آئے وہاں سے نکلنے والے جیسے ہم ان ہی کے تو نوکر ہیں۔ اچھا گیا گاڑی لائے۔ خوب کیا گاڑی لائے۔ اب اس ضد پر تو ہزار مرتبہ لائیں گے۔ دیکھیں ہمارا کوئی کیا کرتا ہے"۔

اسٹیشن ماسٹر: دیکھئے گارڈ صاحب منع کر لیجئے اسکو کیسی کمینہ پن کی باتیں کر رہا ہے۔ افسری ماتحتی کا کچھ خیال نہیں میں چھاتی پر چڑھ کر خون پی لیتا ہوں"۔ **گارڈ**:۔ جانے بھی دو، اماں جانے بھی دو، ہائیں ہاں یہ کیا کرتے ہو، اماں تم ہی ہٹ جاؤ، بھائی تم ہی ہٹ جاؤ، ارے ارے۔ چھوڑو بھی ہٹو بھی، سنو تو سہی، ارے یار سنو تو۔

اسٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو گھونسے لاتیں تھپڑ جوتے، رسید کرنا شروع کر دیے اور تمام مسافر یہ جھگڑا دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ بمشکل تمام گارڈ نے بیچ بچاؤ کیا اور سمجھا بجھا کر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ ابھی بیچارہ سمجھا ہی رہا تھا کہ کسی نے آ کر نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا:۔ "گارڈ صاحب، اے گارڈ صاحب،

اجی وہ مال گاڑی سامنے سے آرہی ہے اور اسی پٹری پر آرہی ہے، غضب ہوگیا“

گارڈ بھی یہ سنتے ہی بدحواس ہوگیا اور چیخنا شروع کردیا۔

”مسافرو جلدی اُترو جلدی اُترو گاڑی لڑتی ہے گاڑی لڑتی ہے جلدی اُترو“۔

سب مسافر گھبرا کر اپنا اسباب کچھ لے کر کچھ چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس گاڑی سے اس بری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے منہ پر آپڑا میں ایک دم سے چونک پڑا۔ حقہ کی نے میرے منہ پر آکر گری تھی۔ آرام کرسی بھی شبنم سے تر ہوگئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے کے قریب تھے میں کرسی سے اُٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا اس لئے کہ اب گاڑی تو سونے کی وجہ سے چھوٹ چکی تھی۔ اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ سوائے آرام سے سونے کے۔

فیشن

فیشن، ”ایک حمام میں سب ننگے“ کا دوسرا نام ہے یعنی اگر دس پانچ پڑھے لکھے یا کوئی بڑا آدمی صرف ایک لنگوٹی باندھ کر بازاروں میں گھومنا شروع کردے تو دو ہی چار دن میں یونیورسٹیوں کے طالب علم اسیطرح کالج جائیں گے وکلا اسی طرح عدالت میں جائیں گے حکام اسی طرح عدالت کریں گے مہذب سے مہذب جلسوں میں لوگ اسی صورت سے شرکت کریں گے اور کچھ دن گذرنے کے بعد جو شخص لنگوٹی باندھے نظر نہ آئے گا اسکو دہقانی، وحشی، غیر مہذب، ہندوستانی، جاہل، بیل، کالا آدمی اور نہیں معلوم کیا کیا کہا جائیگا، بالکل یہی حال ان فیشنوں کا ہے جو آج کل ہمارے اور آپ کے ایسے مہذب لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں کہ سر کے بال پیچھے سے کٹوا دیے اور آگے سے بڑھے رہنے دیئے، اگر کوئی ہم سے کہے کہ آگے کے بال کٹوا دو اور

پیچھے کے پڑھنے دو تو ہم اس پر ہرگز آمادہ نہ ہوں گے اور اس کو ایک قسم کا بے تکاپن سمجھ کر ہنس دیں گے حالانکہ دراصل یہ دونوں صورتیں یکساں ہیں بلکہ اگر ابھی بمبئی میں جہاز سے اُترنے والے مسافر آگے کا سر منڈوائے اور پیچھے کے بال بڑھائے ہوئے اُتریں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ تمام ہندوستان والے یہی حرکت شروع کر دیں۔ اب بھی ہمارے پیش نظر وہ مناظر ہیں کہ ہمارے اس دعوے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کسی بڑے آدمی نے مونچھیں صاف کرا دیں بس تمام ملک مونچھوں سے فارغ البال ہو گیا کسی نے "کرم خوردہ" یعنی دُم کٹی ہوئی مونچھیں رکھیں بس ہر ایک نے اپنی اچھی خاصی مونچھوں کو نذر مقراض کر دیا۔ مختصر یہ کہ اس فیشن کو بھیڑ چال کہئے، کورانہ تقلید کہئے، بوزنہ نقالی کہئے غرضکہ جو کہئے صحیح ہے اور یہ وبا ہندوستان میں تو اس طرح پھیلی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ کوئی ہندوستانی مشکل سے ایسا نظر آئے گا جو اپنی خاص وضع پر قائم ہو ورنہ عام طور پر یہی حال ہے کہ کسی کو ناک کٹاتے دیکھ لیا خود بھی نکٹے ہو گئے۔ کسی کو کتے کا منہ چاٹتے ہوئے دیکھا خود بھی چاٹنے لگے کسی کو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا خود بھی بیٹھ کر پیشاب کرنا حرام سمجھ لیا کسی کو منہ ٹیڑھا کر کے بات کرتے دیکھا اپنا منہ بھی مفلوج بنا لیا غضب خدا کا کہ ان ہندوستانیوں نے غیر ممالک کی تقلید اس حد تک کی کہ اچھائی اور برائی کا بھی امتیاز باقی نہ رہنے دیا۔ انھوں نے دیکھا کہ انگریز ناخن نہیں کٹواتے ہیں بس انھوں نے بھی ناخن بڑھا لئے اگر کسی انگریز نے کرم خوردہ پتلون کا نصف حصہ کاٹ کر پہن لیا تو یہ مقلدین فرنگ فوراً ویسا ہی کٹا ہوا پتلون بنوائیں گے اور اس کو پہن کر خوش ہوں گے کہ ہم میں اور انگریزوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور انگریزوں کی نقالی پر کیا منحصر ہے وہ خود اُن کے اہل ملک کی نقالی بھی کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ دس پانچ بڑے بڑے آدمی اُن کو کسی عجیب غریب وضع قطع میں نظر آجائیں مثلاً جب وہ پہلی مرتبہ کسی شخص کو انگرکھے اور غرارے دار پاجامے پر ہیٹ لگائے ہوئے دیکھیں گے تو اُن کو ہنسی آئے گی اُس شخص کا مذاق اڑائیں گے اور دل ہی دل میں اس کی وحشت پر تعجب کریں گے لیکن جب وہ دیکھیں گے کہ فلاں راجہ صاحب اور فلاں خان بہادر صاحب اور ڈپٹی صاحب اور کوئی موٹر والے رئیس اور علی گڑھ کالج کے طالب علم اور شوکت تھانوی اور دس پانچ اسی طرح کے بڑے لوگ انگرکھے پر ہیٹ لگاتے ہیں تو اُن کے لئے بھی فرض ہو جائے گا کہ ایک انگرکھا محض اس مقصد کے لئے بنوائیں کہ اس پر ہیٹ لگائی جا سکے۔

فیشن کے واسطے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ تنزل سے ترقی کی طرف ہو بلکہ بہت سے فیشن ایسے بھی ہیں جن کو اب سے پہلے خلاف فیشن سمجھا جاتا تھا مثلاً وہ وضع قطع جس کو کسی زمانہ میں یہ کہہ کر ترک کر دیا گیا تھا کہ یہ پرانے

لوگوں کی وضع قطع ہے اور اس میں جہالت کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن آج وہی ان نئی روشنی والوں نے اختیار کر کے فیشن میں داخل کر دی ہے اور سر سے دو پلّی ٹوپی، جامدانی کا انگرکھا چوڑی دار یا غرارے دار پاجامہ دہلی کا کامدار جوتا پہنے نواب بنے پھر رہے ہیں۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ اس لباس کے ساتھ داڑھی مونچھ غائب ہے اور منہ میں سگار لگا ہوا ہے۔ آنکھوں میں بڑا سا چشمہ ہے اور دو پلّی ٹوپی کے نیچے انگریزی بال ہیں۔ لیکن ابھی اگر یہی لوگ ساری باندھنا شروع کر دیں یا سر پر چوٹی رکھ لیں تو رفتہ رفتہ سب اُن کے ہمشکل ہو جائیں گے۔

آجکل کا سب سے زیادہ عام فیشن کھدر پوشی کا ہے جس کو دیکھئے گا مذہبی کیپ برسر چپل زیر پا۔ کھدر کا لمبا سا کرتہ پہنے نظر آئے گا۔ اس وضع قطع کے لوگوں کے لئے یہ سمجھ لینا کہ وہ سب قومی تحریک سے دلچسپی رکھتے ہیں صحیح نہیں ہے ان کو تو صرف اس فیشن سے دلچسپی ہے جو چند بھلے آدمیوں نے اختیار کر لیا ہے۔ وہ تو دیکھتے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو پر کھدر کا چوڑی دار پاجامہ اچھا معلوم ہوتا ہے اور گاندھی کیپ بھی کھلتی ہے اور کھدر کی شیروانی بھی پھوٹی نکلتی ہے بس وہ بھی تکمیل حُسن کے لئے کھدر پوش ہو جائیں گے۔ تکمیل حُسن کے علاوہ ان کے ذہن میں یہ خیال جم گیا ہے کہ آجکل کھدر پہننے والا آدمی خواہ مخواہ بڑا آدمی بن جاتا ہے لہٰذا

وہ اس نادر ترین موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے اور کھدر پہن کر اپنا شمار بھی قومی لیڈروں میں کرنے لگیں گے بلکہ زیادہ تر تو یہ خیال ہوتا ہے نہ نہ بس ایک حمام میں سب ننگے والا معاملہ ہے ہم سچ کہتے ہیں اور یقین نہ آتا ہو تو امتحان کر لیجئے اگر ان ہندوستانی نقالوں کے سامنے چند بدترین چیزیں فیشن بنا کر پیش کی جائیں تو اُن کو فوراً قبول کر لیں گے مثلاً آپ مع اپنے احباب کے سوٹ پر دوپٹہ اوڑھ کر نکلئے یا آپ مع اپنے احباب کے امتحاناً سڑک پر ناچتے ہوئے چلئے یا آپ مع اپنے احباب کے پیروں میں ٹوپی سر پر جوتا پہنکر نکلئے یا آپ مع اپنے احباب کے آزمایش کے لئے منہ پر تارکول لگا کر نکلئے یا آپ مع اپنے احباب کے گدھے پر سوار ہو کر نکلئے تو آپ کو دو ہی دن میں اپنے بہت سے مقلد نظر آئیں گے۔ آپ کو یقین تو نہ آئے گا لیکن ہم کہتے ہیں کہ آخر کار یہ مونچھوں کا منڈوانا کتے کا منہ چاٹنا، نیکر یعنی نصف کٹا ہوا پتلون پہننا تیرن میں کموڈ نہ ہونے کی صورت میں قبض کی شکایت کرنا کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، اپنی مونچھیں اور گھوڑے کی دم کاٹنا، بیوی سے بال کٹوانے کی فرمائش کرنا، ناخن نہ کٹوانا، حلوے کی جگہ پڈنگ پسند کرنا اور اُبلے ہوئے گوشت کو بہترین غذا سمجھنا اس قسم کی باتیں کورانہ تقلید اور بغیر چال کی زندہ مثالیں نہیں تو اور کیا ہیں خدا محفوظ رکھے کہ یورپ میں یہ فیشن روز بروز ترقی پر ہیں اور ہندوستانیوں میں نقالی کی صلاحیت ایسی موجود ہے کہ

وہاں کا ہر تخیل یہاں عملی صورت اختیار کرلیتا ہے معلوم نہیں ہم لوگوں کا حشر کیا ہونے والا ہے۔ الامان والحفیظ۔

سودیشی ڈاک

ہمارے خیال میں فلاسفر اور افیونی سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ بیچارے افیونی تمام دنیا سے علحدہ رہ کر ایک گوشۂ خاموشش میں۔ "ایک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے"۔ کے اصول کو پیش نظر رکھ کر بس ایک پیالی کے مشغلہ میں اپنی زندگی گذار دیتے ہیں اور اُن کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ اس پیالی کو اپنے اوپر طاری کرلیں اور خود اس میں ڈوب جائیں ان کو دنیا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور نہ دنیا اُن کو کچھ سمجھ سکتی ہے لہٰذا ان کی فلسفیانہ محویت کا نام دنیا والوں نے "پینک" رکھا ہے۔ بالکل یہی حال اُن پڑھے لکھے لوگوں کی محویت کا ہوتا ہے جن کو ہم فلاسفر کہتے ہیں لیکن چونکہ ان کے متعلق سب جانتے ہیں کہ یہ زندگی بھر فلسفہ کی کتابیں چاٹا کیے ہیں لہٰذا اُن کی پینک کو لوگ فلسفیانہ محویت کہتے ہیں۔

افیونی اور فلاسفر تو خیر محویت کے لئے مخصوص ہیں لیکن ہم سچ کہتے ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ بہت سے لوگ ہماری تائید کریں گے کہ دنیا کا ہر ذی ہوش انسان جس وقت محویت کا شکار ہو کر عالم تخیل میں کھو جاتا ہے اس کی حالت کسی طرح ایک تجربہ کار افیونی اور ایک ماہر فلسفہ سے کم نہیں ہوتی وہی پینک کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ویسا ہی ہوا میں قلعے بننا شروع ہو جاتے ہیں اور وہی بیداری میں خواب کا عالم ہو جاتا ہے۔

ہم کسی کو کیوں کہیں خود ہمارا یہ حال ہے کہ خود تو تمام دنیا کی اس حرکت پر ہنستے ہیں لیکن جب کبھی ہم پر یہ دورہ پڑتا ہے تو گھنٹوں اس طرح پڑے رہتے ہیں کہ کھلی ہوئی آنکھیں عجیب و غریب مناظر دیکھتی ہیں۔ دماغ اُن مناظر کو اور بھی دلفریب بنا کر اصلیت کے باور کرنے کا فریب دیتا ہے ہم درہم اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے اس طرح لیٹے ہوتے ہیں گویا نہیں ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے کہ دفتر میں تعطیل ہو۔ بیوی میکے گئی ہوئی ہوں، بارش کی وجہ سے باہر نہ نکل سکتے ہوں اور کمرہ میں ہُو کا عالم ہو اس وقت ہم پہلے تو بارش سے لطف اندوز ہوں گے پھر کسی کے خط کا انتظار کریں گے پھر خط آنے کے امکانات پر غور کریں گے یہاں تک کہ اُن کا خط لکھنا لکھ کر ڈاک میں ڈالنا ڈاک کا چلنا چل کر پہونچنا پہونچ کر تقسیم ہونا تقسیم ہو کر ہم کو ملنا وغیرہ سب ہمارے پیش نظر اس طرح ہو جائے گا کہ ہم ان مناظر میں کھو کر بس کہیں کے نہ رہیں گے اور جب

بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک سے چونک کر ہشیار ہوں گے تو خود اپنے کو چارپائی چت لیٹا ہوا پائیں گے اب اسی کیفیت کو چاہے پینک کہہ لیجئے چاہے فلسفیانہ محویت بہرحال کیفیت یہی ہوتی ہے جس کے مختلف نام ہیں۔

کل ہم کو بھائی زبیر کے خط کا انتظار تھا اور اتفاق سے تمام حالات وہی تھے جو ہم کو دوسرے عالم میں آسانی کے ساتھ پہونچا سکتے ہیں یعنی چھٹی بھی تھی اور ہم لیٹے بھی تھے، بیوی بھی سو رہی تھیں، اور ہم بارش کے سبب سے باہر بھی نہ جا سکتے تھے لہٰذا ہم نے ڈاک کے انتظامات پر غور کرنا شروع کر دیا کہ اگر خود ہمارے سپرد یہ انتظام دیا جائے تو ہم کیا کیا اصلاحات کریں اور اسی غور و فکر میں موجودہ نظام اور سوراج مل جانے کے بعد والا انتظام ہماری نظروں کے سامنے تھا یہاں تک کہ ہم کو ڈر لگنے لگا کہ اگر آج ہی سوراج مل گیا تو کیا جو خط آنے والا ہے وہ نہ آ سکے گا اس خیال کے آتے ہی اور تو سب کچھ ہم بھول گئے بس سودیشی ڈاک کا ایک مکمل نقشہ ہمارے پیش نظر ہو گیا ......

"خط لے کر جو ڈاک خانہ پہونچے تو معلوم ہوا کہ اس عمارت میں ترکاری منڈی آگئی ہے اور ڈاک خانہ کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہو لیکن سائن بورڈ بدستور وہی لگا ہے "پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف آفس" اور کھڑکیوں پر تختیاں بھی وہی ہیں "ٹکٹ یہاں بکتے ہیں" "تاریں" "منی آرڈر" "ڈیلوپی ایبل" "سیونگ بینک" "پارسل" "رجسٹریشن" "پوسٹ ماسٹر" "تھوکنا منع ہے" "اندر آنے کی اجازت نہیں"

وغیرہ وغیرہ لیکن حال یہ ہے کہ کوئی تین سو آدمی اس کمرے میں کھڑے غل مچا رہے ہیں جس کے دروازے پر لکھا ہوا ہو کہ "اندر آنے کی اجازت نہیں" اور جہاں کل تک برقی پنکھے کے نیچے ایک بابو جی ناک پر عینک لگائے بیٹھے رہتے تھے آج نہ تو وہ دکھائی دیتے ہیں اور نہ دوسرے بابو نظر آتے ہیں سب کی جگہ پر کچھ لوگ موجود ہیں لیکن اُن کا تعلق ڈاک خانہ سے نہیں معلوم ہوتا، بلکہ رہ رہ کر یہ شبہ یقین کی حد تک پہونچتا جاتا ہے کہ کسی کنجڑیے نے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے یہ جگہ مانگ لی ہے اور اس میں سب براتی ٹھیرے ہوئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ عارضی طور پر سہی بہرحال ڈاکخانہ کو کہاں منتقل کر دیا ہم نے ہر طرف نظر دوڑائی لیکن کہیں ڈاک خانہ کے آثار نظر نہ آئے مجبور ہو کر انہی براتیوں میں سے ایک سے پوچھا کہ: "بھائی ڈاکخانہ آج کہاں ہے"؟

وہ:- "کیسا مطلب کیا ہے؟"

ہم:- مطلب یہ ہے کہ خط ڈالیں گے، ٹکٹ لیں گے، لفافے لیں گے اور دل چاہا تو پوسٹ کارڈ بھی لے لیں گے"۔

وہ:- "لاؤ دام ہم دیتے ہیں سب ابھی"۔

ہم:- "نہیں آپ تکلیف نہ فرمائیے آپ تو صرف ڈاک خانہ بتا دیجئے ہم خود خرید لیں گے"۔

وہ:- "آپ کیا کہیں باہر سے آئے ہیں؟"

ہم:- "جی نہیں خاکسار کا غریب خانہ خاص یہیں ہے"۔

وہ:- "تو آج تک آپ کو نہیں معلوم ہوا کہ ڈاکخانہ کہاں ہے

ہم:- "معلوم کیوں نہیں پہلے یعنی کل تک تو یہیں تھا معلوم نہیں رات بھر میں کدھر کو چلا گیا"۔

وہ:- "واہ جناب واہ آپ بھی عجیب دل لگی باز معلوم ہوتے ہیں۔ اجی لائیے پیسے میں دوں آپ کو ٹکٹ وکٹ"۔

ہم:- "لیکن ہم کو تو خط پر لگانے والے یعنی ڈاک ٹکٹ چاہئے ہیں"۔

وہ:- "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو لینا دینا نہیں ہے۔

ہم:- "لینا کیوں نہیں ہے مگر کس سے لیں آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کریں"۔

وہ:- "جناب کہہ تو رہا ہوں کہ مجھ سے لیجئے میں دیتا ہوں مگر آپ کو تو مذاق سوجھ رہا ہے۔

ہم:- "اور آپ کون؟"

وہ:- "میں پوسٹ ماسٹر صاحب کا بھانجا ہوں اور شاید شام تک سب پوسٹ ماسٹر ہو جاؤں"۔

ہم:- "تو یہ آج آپ کے یہاں مجمع کیسا ہے؟"

وہ:- "سب اپنے اپنے کام سے آئے ہیں جیسے آپ' اچھا لائیے دام"۔

ہم:- "اچھا دو پیسے والا ٹکٹ دیدیجئے اور.."

وہ: دو پیسہ والا ٹکٹ نہیں ہے کہئے تو پانچ پیسے کے دو دو والے دیدوں

ہاں اور کیا؟

ٹکٹ کے یہ نئے دام سنتے ہی بجائے اس کے کہ ہم کچھ بول سکتے ہم نے ایک مرتبہ جلدی جلدی اپنے گرد و پیش اور نیچے نظر دوڑائی کہ ہم کہاں ہیں' ان حضرت کو سر سے پیر تک اور پیر سے سر تک بغور دیکھا اور سب کچھ دیکھ چکنے کے بعد بس منہ کھول کر رہ گئے' ان حضرت نے پھر فرمایا: ہاں تو اور کیا؟ ہم نے جواب دیا۔ "پہلے یہ بتائے کہ ہم سو رہے ہیں یا آپ مذاق کر رہے ہیں؟"

انھوں نے ہمارا یہ جملہ سن کر کچھ منہ بنایا' پھر ایک گھونسا اپنی میز پر مارا اور زیر لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے ایک طرف کو چلے گئے۔ ہم نے کچھ دیر تو ان کی واپسی کا انتظار کیا لیکن جب وہ نہ آئے تو ہم نے ایک قریبی دکان سے پان لینے اور اسی سلسلہ میں پان والے سے تحقیقات کرنے کا ارادہ کیا اور ہم بھی چلے گئے۔ پان والے سے پوچھا تو اس بیچارے نے ایک ہمدرد کی طرح بس اتنا بتا دیا کہ:۔

"حضور ڈاکخانہ تو یہی ہے مگر آج کانگریس والوں کو سوراج مل گیا ہے تو انھوں نے اپنا قبضہ کر لیا ہے اور سب بابوؤں کو ہٹا کر نئے آدمی رکھے ہیں اور سب ٹکٹ لفافے جلا کر نئے لفافے منگائے ہیں آج صبح سے۔ بڑا ہڑبڑ مچا ہوا ہے۔"

پان والے کے بیان سے بہرحال ہم ایک نتیجہ پر پہونچ گئے اور ہم کو شوق ہوا کہ ڈاک کے اس جدید انتظام کے متعلق معلوت حاصل کریں۔ لہٰذا ہم بھی ان ہی دو تین سو آدمیوں کی طرح بیدھڑک "اندر آنے کی اجازت نہیں" کے اندر چلے گئے اور غور سے دیکھنے لگے کہ ان لوگوں میں کون شخص از روئے قاعدہ پوسٹ ماسٹر ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر تک ایک ایک آدمی کی صورت غور سے دیکھنے کے بعد ہم نے ایک صاحب کا بازو پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

"آداب عرض جناب"۔

انھوں نے گھوم کر جواب دیا۔ "آداب عرض' کہئے"۔

ہم نے کہا۔ "کہئے اب خط بھیجنے کا کیا طریقہ ہے"۔

وہ "خط لکھئے اور ٹکٹ لگا کر ڈال دیجئے اور کیا طریقہ ہے"۔

ہم: "اچھا پھر کیا ہوگا"۔

وہ: "ذرا ٹھہر جائیے میں آپ کو سب ابھی بتاتا ہوں پہلے ان لوگوں کو ٹکٹ دیدوں۔"

ہم خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے اور تماشا دیکھنے لگے۔ ان حضرت نے ایک لکڑی کا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک مہر نکالی اب اُن کے چاروں طرف لوگ جمع ہو گئے کوئی کہتا ہے۔ "بابوجی دو آنہ کے دوانی" کسی طرف سے آواز آتی ہے۔ "چار لفافے ایک ٹکٹ دو کارڈ" اور بابوجی ہو،

کہ سب کو ٹکٹ کے نئے دام بتا کر کسی سے ایک آدھ پیسہ چڑھ کر کسی کے ساتھ ایک آدھ پیسہ کی رعایت کر کے کسی کے نام قرض کے کھاتہ پر ڈال کر کسی سے دام طے نہ ہونے پر انکار کر کے کاغذ کے پُرزوں پر مُہر لگا کر دے رہے ہیں اور دام لے کر صندوق میں رکھ رہے ہیں۔ اتنا ہم دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ پُرانے ٹکٹوں کی جگہ یہ کاغذ کے پُرزے استعمال ہو رہے ہیں جن پر مُہر لگا کر دام لکھ دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح سادے کارڈوں اور لفافوں پر بھی مُہر لگا کر دی جاتی ہے۔ اور وہ ڈاک کے لفافے اور کارڈ بن جاتے ہیں لیکن اب تک ہماری سمجھ میں یہ نہ آیا تھا کہ ان ٹکٹوں، لفافوں و کارڈوں کی کوئی مقررہ قیمت کیوں نہیں ہے اس لئے کہ بابو صاحب پہلے خریدار کی حیثیت دیکھتے تھے پھر کچھ غور کر کے دام بتاتے تھے بلکہ یہ بھی کہتے تھے کہ آپ یہ دام دیدیجئے"! اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ گویا وہ ٹکٹ خریدنے والے کا وزن دیکھ کر دام بتاتے تھے اور جو جی چاہا دام بتا دیے کسی سے لفافہ کے دو پیسے لے لئے اور کسی سے دو آنے لے لئے۔ ہم دیر تک یہی تماشا دیکھا کئے آخر مجمع کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا اور بابو صاحب کو یکسوئی حاصل ہوئی تو وہ صندوقچہ بند کر کے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں بھائی صاحب معاف کیجئے گا آپ کو بڑی دیر ہوئی مگر چونکہ مجھے بھی آپ سے باتیں کرنا تھیں اس لئے میں نے یہ زحمت دی۔

میں نے کہا۔ "کوئی مضائقہ نہیں۔"

کہنے لگے: "میں آپ کو اس لئے روک لیا ہے کہ آپ کی صورت سے مجھ کو یہ اندازہ ہوا کہ آپ میرے مطلب کے آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ میرا ساتھ دے کر میری مشکلوں کو آسان کر دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "فرمائیے فرمائیے میں بسروچشم حاضر ہوں۔"

کہنے لگے: "آپ اگر آجکل بیکار ہوں تو تھوڑے دنوں کے لئے اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر بن جائیں۔ میں خود پوسٹ ماسٹر ہوں اور میرا بھانجہ بھی میرے ساتھ کام کرتا ہے لیکن وہ پھر بھی بچہ ہے اور یہ کام ہے بڑی جوکھم کا لہٰذا میں نے آپ کی صورت دیکھتے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ ہی یہ کام کر سکتے ہیں اور آپ ہی میرے مطلب کے ہیں۔"

بیکاری تو ہے ہی بُری چیز اب اس وقت سوچنے اور غور کا کیا موقع تھا۔ ہم نے فوراً اس عہدے کو قبول کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے پوسٹ ماسٹر صاحب سے عرض کیا کہ:۔

"اور تنخواہ کا کیا انتظام ہوگا؟"

وہ۔ "ہاں یہ بات آپ نے اچھا کیا پوچھ لی، بھائی دیکھئے ابھی یہ کام بالکل نیا نیا ہمارے ہاتھ میں آیا ہے ہم کو چاہئے کہ تنخواہ کا خیال چھوڑ کر بس پہلے تو اس کام کو سنبھال لے جائیں پھر تو جو چاہیں گے لے لیں گے۔ ابھی تنخواہ کا

معاملہ یہ ہے کہ آمدنی پر سب دارومدار ہے ہم اور آپ دو آدمی ہیں بس اور ہم دونوں کو تمام آمدنی کا مالک سمجھنا چاہئے پہلے تو خرچ نکال لیں گے پھر جو بچے گا اس میں سے ہم اور آپ آپس میں تقسیم کرلیں گے!

میں نے چونک کر کہا۔ "یعنی اس کی آمدنی کہیں اور نہ جائے گی"۔

وہ۔ "کہیں اور کیوں جانے لگی محنت تو کریں ہم جان دیں ہم ٹکٹ بیچیں ہم اور آمدنی جائے کہیں اور"

ہم۔ "تو آپ سے اور محکمۂ ڈاک سے کیا تعلق ہے"

وہ۔ "اجی کوئی تعلق نہیں، تعلق کیسا ہم خود پورا محکمہ ہیں"۔

ہم نے اور زیادہ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "یعنی چہ"۔

وہ۔ "بھائی اس کو اس طرح سمجھئے۔ دیکھئے میں سب بتائے دیتا ہوں اور غور سے سُن لیجئے۔ ابھی سمجھ جائیے گا۔ اب جیسے یہ ہمارا ڈاک خانہ ہے اس کے ہم مالک ہیں اب جو ٹکٹ وغیرہ ہم بیچیں گے اس کی آمدنی بھی ہماری ہے لیکن اسی آمدنی میں سے خرچ بھی کرنا ہے اب خرچ یہ ہے کہ جن لوگوں نے ٹکٹ وغیرہ لئے ہیں وہ خط لکھ کر ہمارے ہی ڈاکخانہ میں ڈالیں گے اور ہمارا فرض ہے کہ ان کے خط جہاں کہیں کے ہوں وہاں پہونچوائیں تو ہم یہ کریں گے کہ جیسے کانپور کے خط ہیں اور کلکتہ کے خط ہیں اور لاہور کے خط ہیں اسی طرح جہاں جہاں کے خط ہیں ان کو ہم جمع کرتے جائیں گے اور جب

مہینہ پندرہ دن کے اندر وہ بہت سے ہو جائیں گے تو ان کو لے کر جہاں کس کے وہ ہیں وہاں ایک ایک آدمی کو بھیجدیں گے۔ جیسے کانپور کے دو ہزار خط جمع ہو گئے ہم اُن کو لیں گے اور ایک آدمی کے ہاتھ کانپور بھجوا دیں گے وہ آدمی کانپور جا کر ان خطوں کو کسی ایسے ڈاک خانہ میں دیدیگا جہاں ہمارے معاملات ہیں یعنی جس کے خط ہمارے یہاں آتے ہیں جس طرح ہم اُس کے خط اپنے آدمیوں کے ہاتھ یہاں تقسیم کراتے ہیں اُسی طرح وہ ہمارے خط اپنے آدمیوں سے تقسیم کرائے گا اب اُس آدمی کے کانپور جانے اور آنے کا کرایہ اور اُس کی تنخواہ یہ ہے وہ خرچ جو ہم کو اسی آمدنی سے دینا ہوگا اسی طرح ہم کو مختلف مقامات پر آدمی بھیجنا پڑیں گے اور یہاں بھی خط تقسیم کرنے کے لئے آدمی رکھنا پڑیں گے اس لئے کہ اگر ہم خط تقسیم نہ کرائیں تو دوسرے ڈاک خانہ والے ہمارے خط کیوں تقسیم کرانے لگے اب ان تنخواہوں اور کرایوں سے جو بچے گا وہ ہمارا اور تمہارا ہے تو بھائی اس میں مل جُل کر کام کرنے کی ضرورت ہے اپنا پرایا اگر سمجھو گے تو کام کیسے ہو سکتا ہے"۔

ہم نے ڈاک کا انتظام بخوبی سمجھ لیا اور یقین ہو گیا کہ اس میں نقصان ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جب ڈاک خانہ کے تنہا مالک ہم ہی دونوں ہیں تو جو چاہیں گے کریں گے آمدنی ایسی ہے جو رُک ہی نہیں سکتی لہٰذا ہم نے جواب دیا۔

"اگر یوں تو خدانخواستہ نقصان کا امکان ہی نہیں ہے میں حاضر ہوں۔"

وہ۔ "نہیں بھئی صاحب یہ کہئے کہ فائدہ کا امکان نہیں ہے اسلئے کہ ہماری دیکھا دیکھی اور لوگ بھی ڈاک خانہ ضرور کھولیں گے اور جب بہت سے ڈاک خانے ہو جائیں گے" "ظاہر ہے کہ ہم کو وہ آمدنی نہیں ہو سکتی جو اب ہے مگر اللہ مالک ہے۔"

نفع نقصان تو کاروبار میں لگا ہی رہتا ہے بھائی اگر دوسرے ڈاکخانے نے پیسہ کا ٹکٹ بیچا تو ہم کو پیسہ کے دو بیچنا پڑیں گے اسی مقابلہ کا تو ڈر ہے مگر دیکھیں ہم سے سستا کون بیچتا ہے۔ ہم تمام بازار سے اپنا بھاؤ گرا دیں گے

ہم نے پھر خیر سے پوچھا۔ "کیا فرمایا، اور لوگ بھی کھول سکتے ہیں ڈاکخانہ؟"

وہ۔ "کیوں بھائی کیا اکیلے ہم ہی آدمی ہیں کھول کیوں نہیں سکتے اور دیکھئے گا سیکڑوں کھولیں گے۔"

ہم ایک سناٹے میں آگئے لیکن اب اُن حضرت سے کیا کہتے۔ مجبوراً چُپ رہے اور اُن سے کہہ دیا کہ:۔

"اچھا ہم کام کرتے ہیں بتائیے کیا کریں۔"

وہ۔ "میں تو حساب لگاتا ہوں ابتک کی آمدنی کا اور آپ یہ کیجئے کہ لیٹر بکس کھول کر سب خط نکال لیجئے اور جس پر انگریزی ٹکٹ لگا ہو اُس کو پھاڑ کر پھینکدیجئے باقی اپنے ٹکٹوں کے خط جمع کرکے اُن کو الگ الگ کر لیجئے کہ کس شہر کا کون ہے اور یہ بھی دیکھتے رہئے گا کہ اگر کوئی آدمی منی آرڈر وغیرہ لائے تو لے لیجئے گا۔

اور پارسل بھی، دام آپ خود چکا لیجئے گا ہاں اگر کوئی تار دینے آیا کرے تو کہدیجئے کہ تار نہیں ہے۔"

ہم نے پوسٹ ماسٹر صاحب کی تمام ہدایتوں پر عمل کرنا شروع کر دیا اور ہمارے ساتھ ان کے وہ بھانجے جن کو شام تک سب پوسٹ ماسٹر ہو جانے کی امید تھی مصروف کار ہو گئے ہم نے سیکڑوں انگریزی ٹکٹ کے خط پھاڑ ڈالے اور اپنی چھپوائے ٹکٹ کے تمام خطوط یکجا کر کے شہروار تقسیم کر ڈالے اس کے بعد سب کے دام جوڑ ڈالے لیکن یہ کام سب سے زیادہ مشکل تھا اسلئے اس میزان کل کو پوسٹ ماسٹر صاحب کی میزان سے مطابق کرنا اسکولی لونڈوں کی طرح کھیل نہ تھا اس کے لئے بڑے بڑے ریاضی داں ہونا چاہئے لیکن ہم نے جلدی سے پوسٹ ماسٹر صاحب کی میزان کل دیکھ کر اُسی کے مطابق یہ میزان بھی بتادی اب گویا ہم کو چھٹی تھی اور ہم آرام سے بیٹھ سکتے تھے پوسٹ ماسٹر صاحب بھی کرسی پر سر رکھے سو رہے تھے اور اُن کے بھانجے صاحب بھی کہیں گھومنے گئے تھے لہٰذا ہم خاموش بیٹھے رہے اتنے میں ایک صاحب تھیلی میں کچھ روپے لئے ہوئے تشریف لائے اور ہم سے منی آرڈر کرنے کو کہا ہم نے روپے پورے دو سو دس گن لئے اور اُن سے کہا "بس جائیے" انھوں نے کہا۔

"اور رسید؟"

ہم نے مُہر لگا کر ایک رسید بھی دیدی، وہ بیچارے رسید لے کر چلدیئے

اور وہ کاغذ ہم کو دے گئے جس پر فرستندہ اور یابندہ دونوں کے نام اور پتہ لکھے ہوئے تھے۔ ہم ابھی اس کاغذ کو دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک اور صاحب تشریف لائے اور ہم سے پوچھا:۔

"کیوں صاحب ہمارے نام کوئی منی آرڈر آیا ہے؟"

ہم۔ "آپ کا نام؟"

وہ۔ "بلدیو پرشاد کھرے"

ہم۔ "پتہ؟"

وہ:۔ "ترمنی گنج لکھنؤ"

ہم نے اس کاغذ کو دیکھ کر جواب دیا:۔

"آپ کے نام کا تو کوئی منی آرڈر نہیں ہے ایک منی آرڈر بلدیو سہائے کھاپرڈے کے نام کا ہے"

وہ۔ "اجی وہ میرا ہی ہوگا نام غلط لکھ دیا گیا ہے کتنے کا ہے"

ہم:۔ "دو سو دس کا ہے"

وہ۔ "جی ہاں جی ہاں دو سو دس ہی کا تھا لائیے وہ میرا ہے"

ہم۔ "لیکن یہ تو کانپور کا ہے"

وہ۔ "جی ہاں میں کانپور سے آج ہی آیا ہوں وہ میرا ہی ہے"

ہم۔ "تو آپ سردار احمد صاحب کو بلا لیجئے جنھوں نے منی آرڈر بھیجا ہے

وہ کہہ دیں تو میں ابھی دیدوں"

وہ۔ "اجی تو کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں آپ خواہ مخواہ کانپور بھیجیں گے اور وہاں سے واپس آ جائے گا اس طوالت سے کیا فائدہ جب میں یہیں موجود ہوں تو مجھے ہی دیدیجئے نا"

ہم نے تھوڑی دیر تک تمام نشیب فراز پر غور کرنے کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ منی آرڈر کے روپے ان کو دیدیں اور اُن کے دستخط لے لیں لہٰذا ہم نے ان سے دستخط کرا لئے اور روپے ان کے حوالے کر دیئے۔

وہ سلام کر کے چل دیے اور ہم نے اطمینان کی سانس لی کہ ایک جھگڑا تو چکایا لہٰذا منی آرڈر کی رسید اور یابندہ کے دستخط دونوں لے کر رکھ لئے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کے بیدار ہونے کے بعد ہم نے منی آرڈر کی رسید اور یابندہ کی دستخط دونوں ان کے سامنے پیش کر دیے جن کو دیکھتے ہی پوسٹ ماسٹر صاحب ہکا بکا ہو کر بولے:۔ "یہ کیا؟"

ہم نے نہایت اطمینان سے کہا:۔

"ایک صاحب نے منی آرڈر کیا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جن کے نام منی آرڈر تھا وہ خود آ گئے اور میں نے پوری تحقیقات کرنے کے بعد اُن کو روپے دیدیئے اور دستخط لے لئے۔

پوسٹ ماسٹر:۔ "ارے بھائی کیا بکتے ہے ہو منی آرڈر کان پور کا تھا

یہاں کیسے دے دیا۔؟"

ہم۔"جی ہاں اُنھوں نے کہا کہ میں ابھی کانپور سے آ رہا ہوں"

پوسٹ ماسٹر۔ "اور ان کا نام تو بلدیو سہائے کھا پڑے سے لکھا ہوا اور منی آرڈر بلدیو پرشاد کہرے ؟"

ہم۔"جی ہاں جی ہاں اس کے لئے بھی انھوں نے کہا کہ نام اتفاق سے ذرا سا غلط ہو گیا ہے"۔

پوسٹ ماسٹر۔"یار تم نے بڑا غضب کیا نہیں معلوم کون تم سے روپیہ اینٹھ لے گیا۔ تم سے دینے کو کس نے کہا تھا میں نے تو صرف لینے کو کہا تھا"

ہم۔"یہ کیا جناب کہ روپیہ لیا تو جائے اور دیا نہ جائے میں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا"۔

وہ۔"جی ہاں آپ نے تو فرض ادا کر دیا اب اگر بھیجنے والا آ کر اپنے روپیہ کا مطالبہ کرے۔ تو کیا ہو گا؟"

ہم۔"ہو گا کیا؟ اس نے جس کو بھیجا تھا اس کو دیدیا گیا؟"

وہ۔"دیکھئے اس قسم کی باتوں سے شک پیدا ہو جاتا ہے اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آپ ہی پر شبہ کرتا۔

ہم۔"یہ آپ نے اچھی کہی آپ مجھ کو چور بناتے ہیں۔ جناب بس بخشئے، مجھے میں باز آیا آپ میری تلاشی لے لیجئے"۔

وہ۔"جناب آپ مجھ پر آنکھیں تو نکالئے نہیں میں نے آپ کے ایسے بہت سے میاں لوگوں کو آزما لیا ہے"۔

ہم۔"کیا بکتے ہو، ایک شریف آدمی سے ایسی باتیں کرتے ہوئے تم کو ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی خبردار اب زبان نہ کھلے"۔

وہ۔"ایک تو روپیہ دبا لیا اُس پر سے زبان چلاتے ہو یہی شرافت ہے"۔

ہم۔"تم نہیں مانو گے تو میں زبان کے بعد کچھ اور بھی جانتا ہوں"۔

وہ۔"یہ تو اچھی زبردستی ہے کہ روپیہ کا روپیہ لے لیا اور غصہ الگ کر رہے ہیں"۔

ہم اور وہ دونوں دست و گریباں ہونا ہی چاہتے تھے کہ ہمارے کان "خط لے جایئے" کی آواز سے گونج گئے اور اس طلسم تخیل کے ٹوٹتے ہی ہم نے اپنے کو چارپائی سے اُٹھ کر پوسٹ مین کی طرف جھپٹتے ہوئے پایا۔ بھائی زبیر کا خط جس کا انتظار تھا آ گیا۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ بحمداللہ سب خیریت ہے اور آپ کی خیر و عافیت درگاہ خداوند کریم سے نیک مطلوب۔

وی پی

بظاہر تو وی پی کے معنی قیمت طلب پارسل کے ہوتے ہیں جو بذریعۂ ڈاک گاہک کے پاس بھیجا جائے اور اس کو اسی وقت ملے جب وہ پوری قیمت ادا کردے لیکن آپ کو کیا معلوم کہ انگریزی کے انھیں دو حروف میں تجارت کے کیا کیا رموز پنہاں ہیں ہم تو یہ کہتے ہیں کہ انگریزی حروف تہجی کے یہی وہ دو مبارک و مسعود حروف ہیں جو نہ صرف تجارت کی جان، بلکہ تاجروں کی زندگی کا واحد سہارا ہیں۔

تجارت کے دوسرے شعبوں کو چھوڑ دیجئے اور صرف اخبارات اور رسائل کی تجارت میں آپ ان دو حروف کی عظمت ملاحظہ فرمائیے تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ اخبارات اور رسائل کی تجارت کا تمام تر دارومدار صرف وی پی پر ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کے نہیں تو کم از کم ہندوستان کے اخبارات اور رسائل نے وی پی کے متعلق متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیدیا ہے کہ اس کا وصول کرنا اخلاقی فرض ہے۔ حالانکہ اگر آپ دیکھیں تو وی پی کا وصول کرنا خواہ کیسا ہی اخلاقی فرض کیوں نہ ہو لیکن وی پی کا بھیجنا انتہائی بداخلاقی ہے اگر یقین نہ آتا ہو تو کوئی وی پی منگا کر دیکھئے کہ جب وہ آتا ہے اور آپ کو اُس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے تو آپ کا دل ہمارے ان الفاظ کی تائید کرتا ہے یا نہیں۔

اگر وی پی کے مسئلہ پر آپ سنجیدگی کے ساتھ غور کریں تو آپ کو اس نتیجہ پر پہونچنا پڑے گا کہ یہ ایک مہذب قسم کی بے اعتمادی ہے جو تاجر اور گاہک دونوں کی طرف سے یکجہتہ مساوی ظاہر کی جاتی ہے۔ وی پی طلب کرنے کے صاف معنی یہی ہیں کہ روپیہ بھیج کر مطلوبہ شے طلب کی جاتی تو یہ اندیشہ تھا کہ مبادا روپیہ مارا جائے اور مطلوبہ شے نہ بھیجی جائے۔ اسی طرح کوئی چیز اس امید پر بھیج دینا کہ اس کے پہونچنے کے بعد گاہک روپیہ بھیج دے گا اس لئے خطرناک ہے کہ شاید گاہک صاحب بے ایمانی پر اُتر آئیں اور روپیہ ہضم کر جائیں ان دونوں خطروں کو دور کرنے کے لئے وی پی کا طریقہ رائج ہوا ہے جو ہر حیثیت سے محفوظ اور نقد ہے بلکہ وی پی کی جامع تعریف صرف یہ ہے کہ ؎

"کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے"

قصہ اصل میں یہ ہے کہ تجارت کے لئے خواہ وہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو قرض کا لین دین ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوا ہے چنانچہ بہت سے کاروبار جو فیل ہوئے ہیں ان میں

ناکامی کی وجہ صرف یہی کہ بیچارے تاجروں کا روپیہ قرض میں دھرا رہ گیا جو نہ بلوں سے وصول ہو سکا نہ تقاضوں سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدھیا بیٹھ گئی اور غریب تاجر ہاتھ مل کر رہ گیا۔ اس مصیبت کا سدباب کرنے کے لئے بہت سے دوکانداروں نے تو اپنی دوکانوں پر جلی یہ لکھ کر لگا دیا ہو کہ "القرض مقراض المحبت" حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ "القرض مقراض التجارت" اور بہت سے تاجروں کی دوکان پر جلی حروف میں یہ شعر لکھا ہوا نظر آتا ہے ؎

قرض احباب کو دینے سے محبت چھوٹے
گانٹھ سے جائے رقم ہاتھ سے گاہک چھوٹے

اس شعر کے عروضی نقائص کے ذمہ دار ہم نہیں ہو سکتے بلکہ یہاں تو "نقل کفر کفر نباشد" والا معاملہ ہے۔ بہرحال ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ تجارت کے لئے قرض سم قاتل ہے اور اس قرض کے لین دین سے بچنے کی کوشش تاجر خود کرتے رہتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں وی پی کا نسخہ اس قدر مجرب اور تیر بہدف ثابت ہوا ہے کہ قرض کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پہلے پوسٹ مین دام گنوا لیتا ہے اس کے بعد پارسل دیتا ہے خواہ پھر اس پارسل میں سونا نکلے یا مٹی، اس پارسل کا مال پسند آئے یا ناپسند ہو، آپ کے دام وصول ہوں یا پھنک جائیں بہرحال آپ اپنی دی ہوئی رقم واپس نہیں لے سکتے اور وہ پارسل بھیجنے والے کو بجنسہ پہونچا دی جائے گی۔

اسی وی پی کے طریقہ سے فائدہ اٹھا کر بہت سے ایسے تاجر پیدا ہو گئے ہیں جو علاوہ وی پی کے اور کسی طریقہ پر اپنی تجارت کو نہیں چلا سکتے مثلاً "پانچ روپیہ میں ایک گھڑی اور پچاس تحفے والے تاجر۔ اب آپ ہی بتائیے اگر ان کا مال کوئی دست بدست لینے جائے تو وہ مال دیکھ کر پانچ پیسہ دے گا یا پانچ گالیاں سنائے گا اس لئے کہ ان میں ایک تو ہوتی ہے بارہ آنے والی ٹائم پیس اور اس کے علاوہ کوئی چیز بھی ایک پیسہ سے زیادہ قیمت کی نہیں ہوتی کچھ پیسے پیسے والی رسٹ واچ ہوتی ہیں کچھ زنجیریں کچھ پیسے پیسے والے چاقو اور اسی قسم کی دوسری چیزیں جن کی مجموعی قیمت ڈیڑھ روپیہ کے قریب ہوتی ہے اور باقی ساڑھے تین روپیہ نفع۔ مگر اسی ڈکیتی کا جاذب نظر اشتہار دیکھ کر اور "ٹوائے رسٹ واچ" یا "ڈمی پاکٹ واچ" کے معنی نہ سمجھ کر بہت سے سادہ لوح جو بالکل اللہ میاں کی گائے ہیں پھنس جاتے ہیں اور وی پی طلب کر لیتے ہیں۔ جس کے وصول ہوتے کے بعد ان کو اپنا منہ پیٹنا پڑتا ہے۔ اسی طرح شباب آور دوائیں بھی وی پی کے زور پر چلتی ہیں ورنہ کون اندھا ہے جو کوئلہ اور مٹی کے مرکب سفوف کی ایک شیشی پانچ پانچ اور چھ چھ روپیہ میں خریدے گا لیکن اشتہارات کی لچھے دار عبارت ان سے وی پی طلب کراتی ہے اور وی پی وصول کر لینے کے بعد انکو اپنی بیوقوفی پر پچھتانا پڑتا ہے۔

اس قسم کی تجارتیں تو ظاہر ہے کہ صرف وی پی کے بل بوتے پر چل رہی ہیں اور اگر آج وی پی کا طریقہ متروک ہو جائے تو اس قسم کی تمام تجارتوں کا دیوالہ ہی نکل جائے لیکن بہت سی اور تجارتیں بھی ہیں جن میں وی پی کو لکشمی کی طرح پوجا جاتا ہے۔ مثلاً کتابوں کی تجارت یا اخبارات اور رسائل کی تجارت اخبارات اور رسائل نے تو اپنے بھیجے ہوئے وی پی کا وصول کرنا اخلاقی فرض قرار دیا ہے لیکن کتب فروشوں کا بس چلے تو وہ اپنے بھیجے ہوئے وی پی کے لئے یہ فتویٰ جاری کرا دیں کہ اس کا وصول کرنا مذہبی فریضہ ہے اور جو اس کو واپس کر دے گا وہ عذاب جحیم میں مبتلا ہو گا۔ اس لئے کہ ان بیچاروں کی بھی روزی کا ٹھیکرا اگر سچ پوچھئے تو یہی وی پی ہے۔ وہ اپنی تجارت کے نشیب فراز کا اسی سے اندازہ کرتے ہیں کہ کس قدر وی پی طلب کئے گئے کس قدر وصول ہوئے اور کس قدر واپس آئے ان کو روزانہ دن میں دو وقت تو ڈاک کا اس لئے انتظار ہوتا ہے کہ کس قدر وی پی کی فرمائشیں آئیں اور تیسرے وقت نہایت بےصبری کے ساتھ ڈاکیہ کی راہ اس لئے دیکھی جاتی ہے کہ وہ کتنا روپیہ لا کر دیتا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جس وقت پوسٹ مین ڈاک لا کر دیتا ہے کتب فروش صاحب اس ڈاک میں سے وی پی طلب کرنے والے خطوط اس طرح چھانٹ چھانٹ کر الگ کر لیتے ہیں جس طرح تاش کھیلنے والے ترپ کے پتے الگ کرتے ہیں اور ان ہی خطوط کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ گویا یہی نوشتہ قسمت ہے اسی طرح جب وی پی لانے والا ڈاکیہ آتا ہے تو بیچارہ تاجر امید و بیم کی کشمکش

میں مبتلا ہو کر درود شریف پڑھنے لگتا ہے اور جب ڈاکیہ کچھ لا کر دیتا ہے تو اُس کے دو ہی نتیجے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ تاجر صاحب مارے خوشی کے اُچھل پڑیں اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ مفلوج ہو کر بیٹھ جائیں اور وی پی طلب کر کے واپس کرنے والے صاحبان کو دفعہ پانچسو کے ماتحت آنے والی تمام گالیاں دی جائیں۔

وی پی کا ایک رُخ تو یہ تھا جو ہم عرض کر چکے اور دوسرا رُخ یہ ہے کہ وی پی طلب کرنے والے، وی پی وصول کرنے والے یا وی پی واپس کرنے والے صاحبان اس سلسلہ میں کیا کیا کرتے ہیں اس کے متعلق عرض ہے کہ اس کو خود ان ہی کا دل خوب جانتا ہو گا اس لئے کہ موجودہ اقتصادی تباہی کے دور میں وی پی کا طلب کرنا ایک بہت بڑی جراءت ہے اور پھر اس کا وصول کر دینا تو یقیناً ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا جواب نواب بہادر سر مزمل اللہ خاں کی فیاضیوں ہی سے مل سکتا ہے البتہ وی پی کا واپس کر دینا کوئی تعجب کی بات نہیں خواہ یہ کتنی ہی بداخلاقی کیوں نہ ہو۔ قصہ اصل میں یہ ہے کہ کسی کتاب کا اشتہار نظر سے گذرا اور اس کتاب کو پڑھنے کے لئے دل مچلا بس کارڈ اٹھا کر لکھ دیا کہ وی پی مرحمت فرمائیے یہاں تک تو خیر غنیمت تھا لیکن جب وی پی آ گیا اور اُس کو وصول کرنے کے لئے کھری چاندی دینا پڑی تو اُس وقت سمجھ میں آیا کہ روپیہ کی دنیا میں کیا قیمت ہے۔ بہر حال اُس کو وصول کرنا ہی پڑتا ہے

خواہ پھر اسی غم میں گھُل گھُل کر ہی مرنا کیوں نہ پڑے لیکن ایک اور مصیبت جو اس سلسلہ میں نازل ہوجاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر وی پی واپس کر دیا تو خیر ایک آدھ گالی دے کر تاجر صاحب اس سلسلہ کو یہیں پر ادیا ختم کر دیں گے کہ اگر آپ پھر کوئی وی پی طلب کریں تو شاید خود وہی نہ بھیجیں گے لیکن اگر آپ نے وی پی وصول کرلیا ہے تو آپ کا نام وہاں نوٹ کرلیا جائے گا اور پھر جو کوئی نئی کتاب شائع ہوگی اس کا وی پی بلا طلب اس خط کے ساتھ آپکی خدمت میں حاضر ہوجائے گا کہ :۔

"جناب محترم۔ تسلیم۔ ایک جلد ایرانی کوک شاستر قیمتی عمر بذریعہ وی پی' ارسال خدمت ہے۔ آپ کی علم دوستی کو دیکھتے ہوئے ہم بلا طلب یہ وی پی ارسال خدمت کر رہے ہیں۔ اور آپ ایسے علم دوست سے ہم کو توقع ہے کہ اس کو ضرور وصول فرمائیں گے اور اپنی لائبریری میں جگہ دیں گے"۔

اب یہاں یہ کشمکش پیدا ہوجاتی ہے کہ اگر وی پی نہیں لیتی ہیں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ نہ تو ہم علم دوست ہیں اور نہ ہمارے پاس لائبریری ہے اور اگر وصول کرتے ہیں تو ایک روپیہ کی چپت بلاوجہ پڑ رہی ہے۔ بہرحال اگر شرافت آمیز حماقت یا حماقت آمیز شرافت کا غلبہ ہوا تو آپ اس "مان نہ مان میں تیرا مہمان" قسم کے وی پی کو بھی وصول کر ہی لیں گے اور پھر یہ سلسلہ کتب فروش صاحب کی زندگی تک آپ کے ساتھ قائم رہے گا اور تھوڑے دنوں کے بعد آپ اس کے ایسے عادی ہوجائیں گے کہ مثلاً آپ کو کہیں باہر جانا ہے اور وی پی آنے کا خط آپکو مل چکا ہے تو آپ جاتے جاتے اپنی گھر والی سے کہہ جائیں گے کہ "دیکھو جی کل وی پی آئیگا خیال رکھنا" آپ تو یہ کہہ کر چلتے ہوئے اور دوسرے دن آپ کی عدم موجودگی میں وی پی آموجود ہوا تو اس کے آنے کی اطلاع جیسے ہی بیگم صاحبہ کو ہوگی وہ فوراً کہیں گی۔

"ہاں وہ کل کہہ گئے تھے ان کو بٹھاؤ میں پان بھیجتی ہوں اور اُن سے کہہ دو کہ میاں تو شکار کو گئے ہوئے ہیں مگر آپ تشریف رکھئے"۔

اور جب بیگم صاحبہ کو یہ سمجھایا جائیگا کہ وی پی دراصل میاں کے احباب میں سے کوئی صاحب نہیں ہیں بلکہ یہ ایک کتاب ہے جس کے چار روپے دینا ہیں اُس وقت بیگم صاحبہ کے تیور بالکل برعکس نظر آئیں گے۔

"چار روپے کا ہے یہ موا وی پی۔ میں کیا جانوں کتنے کا ہوتا ہے۔ پوچھو اُس سے کہ یہی دام ہیں یا کچھ کم بھی لے گا؟"

جب بیگم صاحبہ کو یہ بتایا جائے گا کہ یہ کوئی چکانے اور مول تول کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ میاں نے اس کو ان ہی داموں میں منگایا ہے تو وہ میاں کو برا بھلا کہہ کر اور بھیجنے والے کو ایک آدھ گز سنا سنا کر وی پی وصول کرلیں گی۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمیشہ وی پی وصول کرنے والے ہی مل جاتے

ہیں۔ جی نہیں بلکہ بہت سے تو ایسے ہوتے ہیں کہ وی پی منگانے کو تو منگایا اور اب یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں اور اس کو کس طرح واپس کیا جائے چنانچہ وہ زیادہ تر تو وی پی کا انٹیمیشن لے کر رکھ لیتے ہیں اور وی پی شریفانہ طریقہ پر خود ہی واپس چلا جاتا ہے ورنہ منگانے والے صاحب اپنے قلم سے خود لکھ دیتے ہیں کہ "مکتوب الیہ کا انتقال ہوگیا" اور وی پی انا للہ پڑھتا ہوا واپس جاتا ہے قصہ مختصر یہ کہ وی پی دراصل "علم دریاؤ"! سے بھی زیادہ وسیع مبحث ہے اس پر جتنا بھی کچھ لکھا جائے کم ہے۔

خودکشی

پیغامبر نے کہا۔ "اس کی شادی ہوگئی"۔

میں نے کہا۔ "کیا بکتا ہے؟"

اُس نے پھر کہا: "اُس نے شادی کرلی"۔

میں نے پھر کہا۔ "تو جھوٹا ہے"

اُس نے اپنی صداقت کے ثبوت میں ایک شادی کا چھپا ہوا دعوت نامہ دکھایا اور میں اُف کہہ کر گر پڑا۔

خیر یہ تو میرا ذاتی رومانی واقعہ ہے جس کو نہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں نہ کسی کو اس واقعہ کے معلوم کرنے کا کوئی حق ہے۔ البتہ عرض یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد میرے لیے سوائے اس کے کوئی اور چارہ ہی نہ تھا کہ میں خودکشی کرلوں اور دنیا کے اس نقش کو جو کسی وعدہ فراموش نے بیدردی

سے سنایا تھا۔ میں اپنے خون کے چھینٹوں سے نمایاں کر دوں تاکہ ناز وفا و جفا کا فیصلہ کرنے کے لئے دشواری میں مبتلا نہ ہو۔

میرا دل واقعی دنیا سے ہٹ گیا تھا اور زندگی سے کچھ ایسی نفرت پیدا ہو گئی تھی جو عام طور پر موت سے ہوا کرتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ خودکشی نہایت ہی بزدلانہ فعل ہے لیکن بعض اوقات اسی بزدلانہ فعل پر عمل نہ کرنا انتہائی بےحیائی اور بزدلی ہوتی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ میرا خودکشی کا ارادہ بالکل حق بجانب تھا اور میری خودکشی یقیناً جائز بلکہ فرض تھی۔ لہٰذا میں اس فرض کی ادائیگی میں ہر ممکن تعجیل سے کام لینا چاہتا تھا۔

رات قبر کی طرح تاریک تھی اور ہر طرف قبرستان کی طرح سناٹا چھایا ہوا تھا مجھ کو دراصل اسی رات اور اسی سناٹے کا انتظار تھا۔ میں چپکے سے اٹھا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر بکس سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ یہ ریوالور جس دن سے خریدا گیا تھا بحفاظت تمام بکس میں مقفل تھا اور اس کا کوئی مصرف سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ دراصل یہ نہایت کارآمد چیز ہے یعنی اس کی مدد سے صرف انگلی کا ایک اشارہ مجھ کو تمام کلفتوں تمام الجھنوں اور تمام اذیتوں سے جو مجھ پر اس ظالم کی شادی کی خبر کے بعد سے گزر رہی تھیں۔ نجات دلا سکتا ہے۔ میں نے ریوالور کو تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا اور احتیاطاً دو تین کارتوس لگا دیے اس کے بعد میری موت خود میرے اختیار میں تھی اگر چاہتا تو اسی وقت اپنے کو قید ہستی سے آزاد کر سکتا تھا لیکن اس کو خون کا جوش کہیے یا محبت کی دیوانگی کہ عین اسوقت سب سے پہلے اپنے دونوں معصوم بچے یاد آئے جو تھوڑی دیر کے بعد یتیم ہونے والے تھے اس کے بعد اس شریک حیات کا خیال آیا جس کا سہاگ لٹ رہا تھا۔ پھر وہ غم نصیب ماں یاد آئی جو مجھ بدنصیب کو اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھ کر جی رہی تھی اور پھر وہ ضعیف باپ یاد آیا جو مجھ کو عصائے پیری کہتا تھا! ان تمام عزیزوں کی صورتیں نگاہوں کے سامنے پھر گئیں اور بیساختہ دل چاہا کہ کم سے کم ایک مرتبہ اور آخری مرتبہ ان سب کو دیکھ لوں میں نے ریوالور احتیاطاً میز پر رکھ دیا اور دبے پاؤں صحن میں پہنچا جہاں سب میٹھی نیند سو رہے تھے سب سے پہلے اپنے بڑے بچہ کو دیکھا جو عالم خواب میں ملکوتی معصومیت کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے آبدیدہ ہو کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور اس سے رخصت ہو کر چھوٹے بچے کی طرف بڑھا۔ دنیا کا یہ سب سے زیادہ بھولا بھی محو خواب تھا بچپن سو رہا تھا اور معصومیت بیدار تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کو بھی خدا کے سپرد کر کے اپنی اس شریک حیات کے قریب گیا جس کی دنیائے مسرت کو اپنے ہاتھوں سے لوٹنے والا تھا۔ یہ عصمت و عفت کی دیوی اپنے مقدس حسن کے ساتھ کوئی لطیف خواب دیکھ رہی تھی ایسا خواب کہ اس کو اپنے سرتاج سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہونے کا بھی ہوش نہ تھا۔ مجھ بیوفا نے اس باوفا کو آخری سلام کیا اور صحن کے دوسرے حصہ میں جا کر اپنی بڑھیا ماں کی زیارت کی جس کے دل کو پاش پاش کرنے کے لئے میں اسوقت بیچین تھا۔ میں نے اس کے نورانی چہرے پر ممتا کی چمک

دیکھی اور اس طرف سے آنکھیں پھیر کر والد کی طرف بڑھ گیا ان کے ضعیف و ناتواں جسم کو دیکھا اور خوب اندازہ کیا کہ غم کا جو پہاڑ اس غریب پر میں توڑنے جا رہا ہوں وہ اس کے لئے بھی پیغام موت ہے۔ لیکن میرے ارادوں میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔

میں اپنے تمام گھر والوں کو دیکھ کر اپنے کمرے میں واپس آیا اور آخری مرتبہ اس کافر کی تصویر دیکھی جو در اصل میرا قاتل تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی تصویر میرے اس ارادہ کا تمسخر کر رہی ہے اور اس کو میرے جان دینے کا اب بھی یقین نہیں ہے میں نے فوراً تصویر میز پر رکھ دی اور ریوالور اٹھا لیا۔ گو ریوالور میرے ہاتھ میں تھا لیکن ہاتھ کانپ رہا تھا غالباً میری موت کے لرزہ خیز تصور کا اس پر بھی اثر تھا۔ اور خود میں اپنے انتقال کے بعد کے مناظر میں کھویا ہوا تھا کہ جس وقت ایک دھماکے کے بعد ریوالور کی قاتل گولی میرے سینے کو توڑتی ہوئی نکل جائے گی میں ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑوں گا اور مچھلی کی طرح تڑپوں گا اسیوقت گھر کے تمام لوگ میرے کمرے میں جمع ہو جائیں گے۔ میری ماں مجھ کو اپنے زانو پر لٹا کر چیخیں مارے گی۔ میرا باپ غش کھا کر گر پڑے گا۔ میری بیوی در و دیوار سے سر پھوڑیگی اور میرے بچے بلک بلک کر روئیں گے۔ میری ماں کہیگی کہ "ہائے میرے لال یہ تم نے کیا کیا مجھ بڑھیا کی کمائی لٹ گئی ارے میرے بچے تیری موت مجھے کیوں نہ آئی اب میں کس کا منہ دیکھکر جیوں گی" میری بیوی دہاڑیں مار مار کر کہے گی "کیا اسی دن کے لئے مجھ سے زندگی

بھر کے ساتھ کا وعدہ کیا تھا ارے ظالم تم کس پر چھوڑ چلے یہ بچے کس کو ابا کہیں گے۔ ہائے کیا میں دلہن سے رانڈ ہو گئی۔ ارے کیا میں بیوہ ہوں؟ ہائے تم مجھ سے کیوں روٹھ گئے ارے میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے کوئی ایک گولی میرے بھی مار دے" میرا بڑا بچہ سب کو روتا دیکھ کر ابا ابا کہہ کر اس طرح روئے گا کہ در و دیوار رو دیں اور چھوٹا بچہ مبہوت ہو کر رہ جائے گا۔ پھر گھر میں باہر کے لوگوں کی آمد شروع ہو گی اور ایک کہرام مچ جائیگا اس کے بعد پولیس آئے گی اور تحقیقات شروع ہو گی اس کے بعد میری لاش پوسٹمارٹم کے لئے میڈیکل کالج بھیجدی جائے گی جہاں لاش کی چیر پھاڑ شروع ہو گی اور آخر میں میرا جسد مردہ میرے اعزہ کے حوالے کر دیا جائے گا اور تجہیز و تکفین ہو گی میرے باپ پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بیہوشی کے دورے پڑیں گے۔ میری ماں اپنے جوان بیٹے کا داغ پچھاڑیں کھا کھا کر قبول کرے گی میری بیوی سفید دوپٹہ اوڑھ کر اور اپنی چوڑیاں توڑ کر حسرت و یاس کا مجسمہ بنجائے گی اور میرے دونوں بچے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے باپ کو ڈھونڈیں گے اور رہ جائیں گے۔

—— میرے ہاتھ سے ریوالور خود بخود چھوٹ کر زمین پر گر پڑا خیریت یہ ہوئی کہ فیر نہیں ہوا ورنہ قبل از مرگ واویلا شروع ہو جاتا۔ میں ان بھیانک تصورات سے سہم گیا تھا اور میرا دل ڈربی کپ کی ریس میں دوڑ رہا تھا میں نے ان حالات پر غور کیا اور طے کر لیا کہ سردست خودکشی کے ارادے کو ملتوی کر دیا جائے تو اچھا ہے اس التوا کے خیال کے ساتھ ہی میرے جسم کا رعشہ میرے

دل کی دھڑکن اور میرے خون کا جمود ختم ہوا میں نے ریوالور اُٹھا کر کارتوس نکال لئے اور ریوالور کو بجنسہ بکس میں رکھ کر مقفل کر دیا۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر سونے کے لئے صحن میں جا رہا تھا کہ میری نظر اسی قاتل تصویر پر پڑی اور مجھ کو محسوس ہوا کہ گویا یہی تصویر حقارت آمیز تبسم کے ساتھ کہہ رہی ہے۔

"چلے تھے مرنے کے لئے! ایسے بہادر تھے تو مر گئے ہوتے"

اس احساس نے خاموش ہو جانے والی آگ کو پھر بھڑکا دیا اور میں نے اپنی موجودہ حالت پر غور کیا تو میں خود اسی نتیجہ پر پہونچا کہ لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو انتہائی بودا پن ہے اس کے علاوہ مجھ سے یہ بیحیائی کی زندگی کیونکر بسر ہوگی کہ وہ وعدہ فراموش مجھ سے بیخبر ہو کر کسی اور کے لئے جنت نظر بنے اور میں ناکام آرزو بن کر رہوں میں نے خود ہی کہا۔ اس زندگی پر تف ہے اور ایک خوفناک ارادہ کے ساتھ اسی وقت مکان کے باہر نکل کر ایک طرف کو چلدیا۔

عالم بیخودی میں ایک قدم کے بعد دوسرا قدم اُٹھاتا ہوا میں جس جگہ پر پہونچ کر رک گیا اور پل پر پہونچ کر یہ چاہتا تھا کہ اپنے ایکبارگی گومتی کی موجوں کے سپرد کر دوں تا کہ بقول مرزا غالب نہ کہیں جنازہ اُٹھے نہ کہیں مزار بنے لیکن جیسے ہی میں نے پل کے ایک دریچہ سے دریا کی طرف دیکھا میرا خون یکایک اس طرح خشک ہو گیا گویا بلاٹنگ پیپر سے کسی نے جذب کر لیا ہے وہ سیاہ سیاہ بل کھاتی ہوئی موٹی موٹی لہریں وہ بھیانک بڑے بڑے گرداب وہ ڈراؤنا موجوں کا تلاطم مختصر یہ کہ اس ہولناک منظر نے دماغ چکرا دیا اور ساتھ پیر تھرانے لگے لیکن باوجود اس کے میں نے چاہا کہ آنکھیں بند کر کے اور ناک اور کان میں کپڑا ٹھونس کر میں جست کر ہی جاؤں کہ میری آنکھوں کے سامنے میری بیوہ کی تصویر آ گئی جو میرا دامن پکڑ کر اور میرے پیروں پر جھک جھک کر مجھ سے التجائیں کر رہی تھی کہ پہلے مجھ کو غرق دریا کر دو اسکے بعد اپنی جان دو۔ میں نے تصور ہی تصور میں اپنی بیوی کی طرف سے گردن پھیر کر اپنے ارادہ پر عمل کرنا چاہا لیکن دوسری طرف میرے دونوں بچے ابا ابا کہہ کر میری طرف دوڑ رہے تھے میں اپنے اس تصور سے اسقدر متاثر ہوا کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور دریا کے پل پر میں نے اشکوں کا ایک اور دریا بہا دیا لیکن باوجود اس کے میں طے کر چکا تھا کہ دریا میں ضرور پھاند پڑوں گا۔ چنانچہ بسم اللہ کہہ کر کلمہ پڑھتا ہوا پل کی دیوار پر چڑھ گیا لیکن وہاں ہوا کا ایک ایسا تیز جھونکا آیا کہ میں دریا میں گرتے گرتے بچا اور بمشکل تمام بیٹھ کر میں نے دیوار کو مضبوط پکڑ لیا۔ جب ذرا دل ٹھہرا تو واپس پل پر اتر آیا اور سوچنے لگا کہ اگر خدانخواستہ گر پڑا ہوتا تو کیا ہوتا۔ لیکن پھر خود ہی مجھ کو خیال آیا کہ اسی مقصد کے لئے تو میں پل کی دیوار پر چڑھا تھا بہر حال کچھ بھی ہو کم سے کم اس وقت تو خودکشی کا تمام جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور مجھ کو اپنی زندگی کی اصلی قیمت محسوس ہو رہی تھی چنانچہ "میں جان بچی لاکھوں پائے" کہتا ہوا پھر گھر کی طرف چلدیا۔

میں جس وقت گھر پہونچا ہوں آخری حصۂ شب کی خنک ہوائیں میرے والدین

اور میرے بال بچوں کو تھپک کر سلا رہی تھیں اور خود مجھ کو نیند کی دعوت دے رہی تھیں لہٰذا میں ایک دو انگڑائی اور ایک دو انگڑائی اور ایک دو جمائی لیتا ہوا بستر پر لیٹ گیا ادھر اُدھر کروٹ لی آنکھیں بند کیں اور —— میں سونے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ یکایک وہی ظالم نہیں قاتل نہیں وعدہ فراموش ہنستی ہوئی ٹھٹھے مارتی ہوئی اور ہنسی سے بل کھاتی ہوئی میرے مکان میں داخل ہوئی میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا مگر وہ میری آنکھوں کے سامنے آگئی اور ایک عجیب مضحکہ خیز انداز سے منہ چڑھا کر انگلیاں نچا کر اور تھرک کر کہنے لگی کہ جو مرنے والے ہیں وہ بغیر اطلاع کے مر جاتے ہیں اور جو صرف مرنے سے ڈرتے ہیں، وہ تمہاری طرح گیدڑ بھبکیاں دکھا کر رہ جاتے ہیں"

اس طنز نے گویا پٹرول چھڑک کر میرے تن بدن میں آگ لگا دی اور میں ایک فیصلہ کن ارادے کے ساتھ تڑپ کر اُٹھا —— میری آنکھ کھل گئی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور تمام جسم پسینہ سے تر تھا لیکن میں نے اپنے اس خواب کو ایک غیبی اشارہ سمجھا سچ تو ہے کہ اس خواب نے میرے ارادوں میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ خودکشی کا وہ ارادہ جو ملتوی ہو چکا تھا پورے جوش و خروش کے ساتھ پھر پیدا ہوا اور میں نے طے کر لیا کہ اب مجھ کو زہر کی شیشی سے آخری مرتبہ قطعی طور پر اپنا فیصلہ کر لینا چاہیے چنانچہ میں اپنے کمرے کی طرف جھپٹا اور طاق سے قاتل زہر کی شیشی کو منہ کے قریب لا کر ایک ہی گھونٹ میں ختم کر دینا چاہا لیکن اس کی تیز اور تیر کی طرح سخت بو میری ناک کے نتھنوں سے گزرتی ہوئی دماغ میں پہنچی اور میں ایک جھرجھری کے

ساتھ پھر لیٹنے پر مجبور ہوا —— عین اسی وقت مجھ کو خیال آیا کہ نہ میرے پاس کوئی جائیداد ہے نہ زر لہٰذا میری آنکھیں بند ہوتے ہی سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ میرے نازوں کے پالے ہوئے بچے یتیم خانہ میں داخل کر دیے جائیں گے میری بد نصیب بیوہ سلائی سے اپنی گزر کرے گی میری ماں اور میرا ضعیف باپ ان دونوں کا خدا جانے کیا حشر ہوگا۔

یہ خیال خدا جانے کس قدر غمناک تھا کہ میں نے آنسو بہانا شروع کر دیے اور میرے انہی خیالات کی تصویریں میری نگاہوں کے سامنے پھرنے لگیں کہ میرے لاڈلے میرے پیارے بچے یتیم خانہ میں ان کا سر منڈا ہوا ہے چار خانے کا موٹا کرتا پہنے ہوئے ہیں مہتمم یتیم خانہ اُن کے سُرخ و سپید رخساروں پر طمانچے مار رہا ہے اور جیل کے قیدیوں کی طرح اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے قالین بافی میں مصروف ہیں، میری بیوہ سفید پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ایک جھونپڑی میں بیٹھی ہے آنکھوں میں آنسو ہیں اور ہاتھ میں سوئی آنسو گرتے جاتے ہیں اور کپڑا سلتا جاتا ہے۔ میری بوڑھیا ماں روتے روتے اندھی ہو چکی ہے اور باپ کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ میں ان مناظر کو زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ زہر کی شیشی میں نے پھینک دی اور اپنے استقلال پر خوب جی کھول کر رو دیا۔ ہائے کیا میری جوان موت تھی؟ اور آہ کیسا میرا بھرا گھر میری ظالم موت نے تباہ کیا تھا۔ میں اپنے کو خوب رویا اور جب خوب اچھی طرح رو چکا تو مجھ کو محسوس ہوا کہ میرا دل ہلکا ہو گیا ہے اب میں نے

سنجیدگی کے ساتھ خودکشی کے مسئلہ پر غور کیا تو میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ خودکشی شرعاً قانوناً اخلاقاً اور ہر حیثیت سے ایک مذموم فعل ہے اگر مر گئے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب جہنم میں مبتلا رہیں گے اور یہ گناہ کبھی نہ بخشا جائے گا —— لیکن نہ مر سکے تو موت کی تکلیف بھی اُٹھانا پڑے گی اور پھر قانونی گرفت میں گرفت میں پھنس کر جیل میں چکی بھی چلانا ہوگی۔ اس کے علاوہ چونکہ خودکشی واقعی ایک بزدلانہ فعل ہے لہٰذا اگر ہم بہادر ہیں تو ہم کو یہ بزدلی نہ کرنا چاہئے پھر یہ تو بڑی حماقت ہے کہ ہم اپنی جان سے جائیں اور رقیب مزے اُڑائے اگر مرنا ہی ہے تو پہلے اس کو روانہ کریں پھر اگر حالات نامناسب ہوں تو خود بھی روانہ ہو جائیں۔ عین اسی وقت ہم کو الہامی طور پر شاعر کا یہ شعر یاد آیا ؎

کہہ دو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال
مر مر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے

لہٰذا تا دم تحریر ہم ہجر یار میں مر مر کر بفضلہ بقید حیات ہیں۔ خدا ہماری عمر میں برکت دے۔ حالانکہ اب تو خودکشی کا ارادہ بھی نہیں ہے اس لئے کہ سُنا ہے کہ اُن کے یہاں بچہ بھی ہوا ہے اور ہم رفتہ رفتہ ان کے خیال کو بھول کر آج اس طرف سے بالکل خالی الذہن ہو چکے ہیں البتہ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ تین مرتبہ ہماری فطری بہادری نے ہم کو خودکشی کے بزدلانہ فعل سے

بچایا ورنہ آج ہم عرصہ کے خدانخواستہ ہو چکے ہوتے۔

آسیبی خلل

کہنے لگے "آسیب؟"

ہم نے عرض کیا "جی ہاں آسیب واللہ آسیب"

کہنے لگے "ہش"

ہم نے عرض کیا "آپ کو اختیار ہے بہر حال ہم نے تو یہ مکان اسی لئے چھوڑا اور جان بچا کر یہاں سے بھاگے ہیں آپ کو بھی اسیلئے بتادیا ہے کہ آپ کے ساتھ بال بچے ہیں، بہر حال اب آپ جانیں اور آپکا کام مگر اب آپ شکایت نہ کیجیے گا کہ پہلے نہ بتایا۔"

انھوں نے بغور سن کر داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ہم کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ عجیب ہی قسم کے آدمی ہیں، ورنہ کسی مرد مسلمان کو اس قسم

کے خبائث سے ڈرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔"

ہم نے کہا: "تو پھر کیا ہے آپ اگر ایسے پکے مسلمان ہیں تو بسم اللہ ہم تو اس کو نعمت سمجھتے ہیں کہ کوئی پڑوسی مل جائے مگر اس مکان میں عرصے سے کوئی کرایہ دار نہیں آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب آپکا سا بزرگ پڑوسی ملا ہے مگر اس خوشی کے ساتھ یہ رنج بھی ہے کہ اب ہم سے آپ کا پریشان ہونا دیکھا نہ جائے گا۔

مولانا نے بزرگانہ تبسم کے ساتھ فرمایا۔

انشاء اللہ سب خیریت رہے گی۔"

قصہ یہ تھا کہ ہمارے پڑوس میں ایک مکان خالی تھا اور اس کے خالی رہنے سے ہم کو طرح طرح کے آرام تھے۔

مثلاً یہ کہ کوئی مہمان آیا تو اسی میں ٹھہرا دیا۔ خود کبھی ضرورت ہوئی تو اسی میں جا کر سو رہے۔ نہانے کی ضرورت ہوئی تو اسی مکان کا غسل خانہ استعمال کیا مختصر یہ کہ ایک مکان کا کرایہ دیتے تھے اور گویا دو مکانوں پر قبضہ رکھتے تھے اس صورت میں قدرتی طور پر ہماری یہ خواہش تھی کہ یہ مکان ہمیشہ خالی رہے اور اس میں کوئی کرایہ دار نہ آنے پائے چنانچہ خدا معلوم کتنے کرایہ داروں کو ہم اسی طرح اڑا چکے تھے کہ جہاں انھوں نے آسیب کا نام سنا بس آیت الکرسی پڑھتے ہوئے بھاگے مگر یہ مولانا خود ہی کچھ ایسے آسیب قسم کے واقع ہوئے

تھے کہ ہمارے اس کھٹرے میں نہ آئے اور ہم نے لاکھ سمجھایا لیکن وہ حضرت ہمارے پڑوسی بن ہی گئے۔

یہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ مولانا کے آجانے کے بعد ہم کو کس قدر تکلیف ہو گئی ظاہر ہے کہ جو شخص دو مکانوں میں پھیلا ہوا ہو اس کو اگر ایک ہی مکان میں رکھا جائے تو وہ خوش نہیں رہ سکتا۔ بہرحال مجبوری کا نام صبر ہے لیکن ہم اپنی کوششوں سے اب تک غافل نہ تھے اور امید کی ایک جھلک اس بات سے پائی جاتی تھی کہ خود مولانا جو بظاہر بہت زیادہ بہادر بن رہے تھے کچھ سٹپٹائے ہوئے ضرور تھے۔ چنانچہ جب آپ مکان میں اپنی گرہستی کی باقاعدہ ترتیب فرما چکے تو باہر تشریف لائے اور اس خاکسار کو بلا کر فرمایا۔

"اب میں دو ایک روز میں بچوں کو لے آؤں گا اور وہ بھی آپ کے یہاں کے بچوں سے مل کر خوش ہوں گے۔"

ہم نے عرض کیا: "ہاں صاحب آپ کی وجہ سے بڑی آبادی ہو گئی اور ہم تو گھر کی طرف سے اب بالکل بے فکر ہو گئے ہیں۔"

راز دارانہ طریقے پر فرمایا: "آپ نے آسیبی خلل کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا تو میں قائل نہیں ہوں لیکن یہ تو فرمائیے کہ آخر ہوتا کیا ہے جس کو آپ آسیبی خلل کہتے ہیں۔"

ہم نے معصومیت کے ساتھ کہا: "صاحب اللہ جانے کیا ہوتا ہے بہرحال ایک مرتبہ تو میں نے خود کسی کو پہلے تو چھت پر چلتے ہوئے دیکھا پھر صحن میں کوئی ٹہلتا ہوا نظر آیا اور میں جو اس کو پکڑنے کے لئے دوڑا تو دیکھتا کیا ہوں کہ چارپائی سے بندھا ہوا ہوں۔"

تشویشناک طریقہ پر آنکھیں پھاڑ کر بولے: "واللہ"

ہم نے کہا: "اور سنئے اسی مکان میں ایک صاحب اور رہتے تھے ان کو تو بہت ہی پریشان کیا گیا۔ روزانہ سوتے میں چارپائی سے الٹ دیا جاتا تھا۔ اور ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ ان کا سر نابدان میں ٹھونس دیا گیا تھا اسی کے بعد سے وہ بخار میں ایسے مبتلا ہوئے کہ پھر جانبر نہ ہو سکے۔"

مولانا نے گھبرا کر کہا: "یعنی مر گئے؟"

میں نے کہا: "جی ہاں پھر وہ نہ بچ سکے"

یہ قصہ کچھ سچا بھی تھا اس لئے کہ ایک صاحب کا اسی مکان میں انتقال ہوا تھا پانچ سال سے دق میں مبتلا تھے۔

مولانا نے فرمایا: "یہ تو جناب بڑی مصیبت ہے۔ فرض کر لیجئے کہ ــــ"

اندر کچھ کھٹکا سا محسوس ہوا غالباً بلی نے کوئی پتیلی کھولی ہو گی اور مولانا سہم کر ہماری آغوش میں آگرے۔ ہم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی بلی وغیرہ معلوم ہوتی ہے یا شاید وہی ہو۔"

مولانا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُنکے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے اور ہم بھی اسی لئے خاموش رہے کہ گویا ہماری تائید غیبی تھی۔ تھوڑی دیر تک عالم سکوت میں رہنے کے بعد مولانا نے چپکے سے کہا۔

"اگر آپ مہربانی فرما کر آج رات کو میرے ہی مکان میں سوئیں تو ذرا اطمینان رہے گا۔"

ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو آپ معاف فرمائیں البتہ آپ خود میرے یہاں آرام فرما سکتے ہیں۔"

بہرحال اس رات کو مولانا نے غریب خانہ پر آرام فرمایا اور ٹھیک اس وقت جبکہ مولانا خواب شیریں میں غافل تھے اور زور و شور سے خراٹے لے رہے تھے ہم اس کام میں مصروف تھے کہ اُن کے گھر میں جا کر تمام چارپائیوں کو اوندھا کر دیا، کرسیاں اُلٹی رکھ دیں، تخت اُلٹ دیے، گھڑے اور صراحیاں اوندھا دیں، تمام بکس اور پیٹیاں اُلٹ کر رکھ دیں۔ مختصر یہ کہ جو چیز بھی نظر آئی اس کو قلابازی کھلا دی اور ایک گھنٹہ کی اس جد و جہد کے بعد آ کر سو رہے۔

صبح کے وقت معلوم نہیں اس منظر سے مولانا نے کیا اثر لیا۔

بہرحال ہم جب سو کر اُٹھے تو مولانا اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے ملے، چہرہ اُترا ہوا تھا اور جسم کا خون خشک تھا۔

ہم نے پوچھا "خیریت تو ہے؟"

کہنے لگے "جی ہاں یہی خیریت سمجھئے کہ رات کو اس گھر میں نہیں سویا۔ ورنہ خدا جانے کیا ہو جاتا۔ ذرا اندر چل کر دیکھئے کہ معلوم ہوتا ہے کسی نے رات کو اس گھر کے زمین و آسمان کو بدل دیا ہے۔ اگر یہ صورت ہو تو صاحب میں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا"

ہم نے اُن کے ہمراہ گھر میں جا کر ہر چیز کو بجنسہ ویسا ہی پایا جیسا کہ ہم نے رکھا تھا۔ مولانا کہتے جاتے تھے کہ

"دیکھئے یہ گھڑا بھی اوندھا ہے اور دیکھئے یہ میز بھی اُلٹی پڑی ہے"

اور ہم گویا نقش حیرت بنے ہوئے تھے آخر میں ہم نے مولانا سے کہا۔

"آپ آج اس مکان میں دھونی دیجئے۔ اور میں آپ کو پڑھی ہوئی کیلیں دیتا ہوں وہ ہر گوشہ میں لگا دیجئے انشاء اللہ کچھ نہ ہوگا۔"

اب مولانا کی رگ مولویت پھڑکی اور فوراً انھوں نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"اجی استغفراللہ میں یہ ٹوٹکے نہیں کرتا ان سب کا علاج کلام پاک میں موجود ہے میں آج ہی سب بندوبست کئے دیتا ہوں۔"

مولانا کو کیا معلوم تھا کہ ہمارے قسم کے آسیب کا علاج کلام پاک میں نہیں ہے بہرحال وہ اپنی ایمانی مضبوطی کے ساتھ تمام دن نمازیں

پڑھتے رہے اور شام ہی سے تمام گھر کو چراغوں سے جگمگا دیا البتہ رات کو یہ ضرور کیا کہ زبردستی ہمارا بستر بھی اپنی ہی طرف اُٹھا لے گئے۔ اور سونے سے قبل کلام پاک سرہانے رکھ کر اطمینان کر لیا اور نچان پر کھیل کر سو رہے۔

واقعہ قائل ہونا پڑتا ہے ایک مسلمان کی اس ایمانی طاقت کا جو روحانی طور پر اس کو حاصل ہوتی ہے ورنہ اس قسم کے موقعوں پر کوئی اور ہوتا تو گزشتہ رات کے واقعہ کے بعد بھلا اس مکان میں سو سکتا تھا مگر ہمارے مولانا اس طرح سو رہے تھے کہ گویا گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں یہاں تک کہ جب ہم نے اُن کے سرہانے سے کلام پاک اُٹھا کر طاق پر رکھا ہے۔ اُس وقت بھی اُن کو خبر نہ ہوئی اور جب ہم نے انکو چارپائی سے باندھا ہے اس وقت بھی وہ سوتے ہی رہے یہاں تک کہ لالٹین گل کرنے کا بھی ان کو پتہ نہ چلا۔ مولانا کو باندھنے کے بعد ہم نے خود اپنی چارپائی میں اپنے کو بھی باندھ لیا اور سو گئے۔

کوئی رات کے ۲ یا تین بجے ہوں گے کہ مولانا کی نہایت آہستہ مگر لرزتی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں آئی اب جو ہم نے گردن اُٹھائی تو مولانا نے چپکے سے فرمایا۔

"مجھے کھولو میں بندھا ہوا پڑا ہوں"

ہم نے بھی ترکی بہ ترکی اسی طرح اپنی دبی آواز میں کہا۔

"مجھ کو باندھ دیا ہے خدا کے لئے مجھ کو کھولئے"۔

مولانا نے خوف کے مارے آنکھیں پھاڑ کر کہا:۔

"ارے بھائی چپکے چپکے پڑے رہو میں بندھا بھی ہوں اور اختلاج بھی شدت سے ہو رہا ہے"

میں نے تعمیل حکم میں آہستہ سے کہا:۔

مجھ کو تو بہت زور کے ساتھ پیشاب محسوس ہو رہا ہے۔ اب کیا کروں"؟

مولانا نے اپنے جسم کو چپکے جنبش دی لیکن قسمت تو دیکھئے کہ عین اُسی وقت چارپائی چرچرا اُٹھی اور مولانا اس آواز اٹینشن ہو کر اس طرح لیٹ رہے کہ سانس بھی روک لی۔ تھوڑی دیر تک جب وہ جب وہ چپ پڑے رہے تو ہم نے خود ہی کہا۔

"ارے یہ رسی تو رینگ رہی ہے"

یہ سننا تھا کہ مولانا کا اور بھی انتقال ہو گیا اور انھوں نے گڑبڑا کر کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور ادھر ہم نے بھی ڈاکٹر اقبال کا شکوہ اس طرح گنگنانا شروع کیا کہ گویا رو رو کر اپنے گناہوں سے توبہ کر رہے ہیں۔

اب یہ حال تھا کہ جہاں کسی چوہے وغیرہ نے کھٹ سے بھی کیا مولانا کا وظیفہ

سول سروس کپ کی ریس کی طرح تیز ہوتا جاتا تھا اور اس کے بعد پھر یہ جوشش نارمل ہو کر رہ جاتا تھا۔ بہرحال اب تو وہ بیچارے مارے ڈر کے جنبش کرنا تو درکنار رسی کو بھی نہیں چھو سکتے تھے کہ مبادا وہ بقول ہمارے رینگنے نہ لگے۔ ادھر ہم کو نیند آرہی تھی اور جمائیوں کے مارے ناک میں دم تھا۔ لیکن ہم ہمیشہ کے آرام کے لئے ایک رات کی نیند خراب کر کے تکلیف اٹھا سکتے تھے اور ہم کو یقین تھا کہ اس ایثار اور اس قربانی کا پھل ہم کو ضرور ملے گا بہرحال اسی عالم میں ہم نے رات گذاری اور ٹھیک اس وقت جب گھڑیال نے پانچ کا گھنٹہ بجایا ہے۔ ہم نے جمائی لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا اور مولانا کے بھی جان میں جان آئی۔ اب روشنی رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی تھی یہاں تک جب رات کی خوفناک سیاہی سرگیں ہو گئی اور ہم مولانا کو اور مولانا ہم کو آسانی کے ساتھ دیکھنے کے قابل ہو گئے تو ہم نے دیکھا کہ مولانا واقعی بیچارے اتنی ہی دیر میں اس قدر گھل گئے تھے کہ گویا چالیس دن کی شدید تپ کے بعد اٹھے ہیں۔ ان کی اس حالت پر بے ساختہ ہمدردی پیدا ہو گئی اور دل بھر آیا۔ ہم نے اپنی رسی کسی نہ کسی طرح ڈھیلی کر دی اور خود کو اس شکنجہ سے نکال کر مولانا کو بھی کھولا اور ان کو اٹھا کر اپنی طرف لے آئے تاکہ ان کے حواس ٹھیک ہو جائیں مگر مولانا کو تو جیسے چپ لگ

گئی تھی۔ وہ مبہوت بیٹھے رہے ایک وحشت ان پر برس رہی تھی اور ہم بھی گویا پریشان سے تھے۔ آخر کار جب مولانا کو چائے وغیرہ پلائی اور ان کے جسم میں تھوڑی سی گرمی پہونچنے کے بعد رات بھر کا منجمد خون حرکت میں آیا تو وہ بولے:۔

"واللہ عقل کام نہیں کرتی۔"

عرض کیا "کیا کہا جائے صاحب۔"

کہنے لگے: "دیکھئے تو ذرا پہلے تو غافل سلایا گیا پھر کلام پاک ہمارے سرہانے غائب۔ روشنی گل اور مجکو اور آپ کو باندھ دیا گیا اور پھر آپ کہتے ہیں کہ رسی رینگ رہی تھی۔"

ہم نے کہا "جی ہاں جناب مجھ کو تو بالکل یہ معلوم ہوا کہ گویا میں کسی جاندار سانپ سے بندھا ہوا ہوں مجھ کو اس میں حرکت محسوس ہوئی کیا آپ کی رسی نہیں رینگی۔"

غور کر کے کہنے لگے: "شبہ تو کچھ مجھ کو بھی ہوا تھا مگر میں نے تو رسی کو چھوا تک نہیں کہ خدا جانے کیا واردات ہو۔"

ہم نے سنجیدگی سے کہا: "بہت اچھا کیا کہ آپ نے رسی نہ چھوئی بہرحال جناب اب میں تو اس مکان میں نہیں سو سکتا۔ آپ جانیں اور آپ کا کام۔"

کہنے لگے "حضرت میں خود نہیں سو سکتا جان بھی لاکھوں پیارے مگر ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر کلام پاک میرے پاس سے نہ اُٹھایا جاتا تو یہ واقعہ نہیں ہو سکتا تھا ورنہ کلام پاک اُٹھانے کی کیا وجہ؟

عرض کیا ہاں صاحب یہ بات تو واقعی آپ نے خوب نکالی یقیناً کلام پاک کی موجودگی میں یہ باتیں نہیں ہو سکتی تھیں"۔

مولانا اسی اُدھیڑبن میں رہے اور ہم دفتر چلے گئے۔ معلوم نہیں دن بھر مولانا نے کیا کیا بہرحال جب ہم شام کو دفتر سے واپس آئے تو یہی معلوم ہوا کہ مولانا تمام دن اپنے دولت خانہ تشریف نہیں لے گئے اور غریب خانہ ہی پر رونق افروز رہے ہیں ہم کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"بھائی صاحب میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ یا تو میں اپنے کو مسلمان کہنا چھوڑ دوں ورنہ میں رہوں گا اسی مکان میں، اس قسم کے بھوت پریت سے ایک سچے مسلمان کے ڈرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ یا تو مسلمان نہیں ہے ورنہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلامی تعلیم کو جھوٹا سمجھتا ہے"۔

ہم نے ایک سچے مسلمان کی طرح کہا۔

"جزاک اللہ مولانا واقعی آپ مسلمان ہیں خدا کرے ہر مسلمان ایسا ہی مضبوط ایمان رکھے اور خدا مجکو بھی یہ ایمانی تقویت عطا کرے"۔

نخرے بولے "لاحول ولا قوۃ۔ میں ان گیدڑ بھبکیوں سے مرعوب ہو کر مکان نہیں چھوڑ سکتا جو مجھ کو ستاتے ہیں اُن ہی کو مکان چھوڑنا پڑیگا میں ان بھوتوں کے لئے خود بھوت بن کر رہوں گا۔

ہم نے کہا:- مگر جناب میں آج وہاں نہیں رہوں گا۔ خواہ اس کو آپ ایمانی کمزوری کہیں یا کچھ مجکو اس کا اعتراف ہے مگر مجبور ہوں میں اپنے دل سے"۔

ذرا سنبھل کر بولے "آپ میرے ملازم کو وہاں سلا دیجئے گا"۔

مولانا راضی ہو گئے اور یہاں ملازم کو پڑھانے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی وہ خود اس قسم کے معاملات میں گریجویٹ قسم کا انسان واقع ہوا تھا بہرحال رات کو دس بجے تک تو ہم خود مولانا کے پاس بیٹھے رہے اور جب وہ تعویذ وغیرہ اپنے بازو پر باندھ کر بستر پر جانے لگے تو ہم بھی ملازم سے یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ ذرا ہوشیار سونا اور خبردار ڈرنا نہیں مولانا موجود ہی ہیں"۔

معلوم نہیں مولانا سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ بہرصورت جب ایک بجے رات کے قریب ہم سفید کفن میں لپٹے ہوئے اُن کی چھت سے اُتر کر ان کے صحن میں آئے ہیں تو ان کا منہ لحاف کے اندر داخل دفتر تھا ہم نے پہلے تو صحن میں ٹہلنا شروع کیا مگر جب اس کی اطلاع مولانا کو نہ ہو سکی تو دو تین ڈھیلے اُٹھا کر یکے بعد دیگرے ہم نے مولانا کی

طرف روانہ کئے۔ یہاں تک کہ مولانا گھبراکر اٹھ بیٹھے اور پھر فوراً مردوں کی طرح چت لیٹ گئے۔ غالباً مولانا نے ہم کو دیکھ لیا تھا اس لئے کہ اب ان کی سانس بھی غالباً رکی ہوئی تھی ہم برابر ٹہلے گئے اور اب ہم نے ناک میں کہنا شروع کیا۔

نگا

"ابیں میں تجھکوں کچّاں کھانجاؤں گا" (ابے میں تجھ کو کچا کھا جاؤں) یہ سننا تھا کہ مولانا نے لحاف کے اندر ہی سے دیوانہ وار چیخنا شروع کیا ان کی ان کی گھگھی بندھ گئی اور اُن کے ساتھ ہمارے ملازم صاحب نے بھی شر ملانا شروع کر دیئے ادھر ہم وہاں سے غائب اور مولانا کے دروازے پر آکر ہم نے "کھولو کھولو" کہہ کر دروازہ پیٹنا شروع کیا اور آخر کنجی توڑ کر گھر میں آگئے ورنہ مولانا کا تو شاید وصال ہی ہو جاتا ہم نے جب پندرہ منٹ تک مولانا کو تسلی دی ہے، پانی کے چھینٹے دیئے ہیں تب جاکر ان کو ہوش آیا اور ان کا دل ٹھہرا۔

دوسرے دن صبح ان کو شدید بخار تھا اور اسی بخار کی حالت میں وہ اپنا اسباب دوسرے مکان میں منتقل کر رہے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ مکان [illegible] ہمارے تصرف میں ہے اور اس واقعہ کے بعد سے تو ہم کو کسی [illegible] کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اسلئے [illegible] گری گراں داد آتا ہی نہیں۔

* * *

مطبوعات حسامی بکڈپو

آدمی نامہ
مجتبیٰ حسین

جاناں جاناں
شعری مجموعہ
احمد فراز

مطلع عرض ہے
شعری مجموعہ
دلاور فگار

رقص مے
خمار بارہ بنکوی

دکن اداس ہے یارو
مرزا ظفر الحسن

ذکرِ یار چلے
مرزا ظفر الحسن

عمرِ گزشتہ کی کتاب
مرزا ظفر الحسن

قصہ مختصر (زیر طبع)
مجتبیٰ حسین

ذرا مسکرا دو (زیر طبع)
ڈاکٹر طاہر قریشی

پان چلیں
حسین

شفق (شعری مجموعہ)
سعید شہیدی

تکلف برطرف
مجتبیٰ حسین

گھاٹا پگارنا
حنیظ عنایت اللہ

بالآخر
مجتبیٰ حسین

شہر نگاراں (زیر طبع)
سبط حسن

ادبی کتابوں کا واحد مرکز

ناشر
حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد ۲
فون نمبر ۴۴۳۸۵